رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

شوال المکرم ۱۳۷۰ھ جلد ۳۶ عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے اس پرچہ کی قیمت بارہ آنے

فہرست مضامین

جمادی الاولیٰ ۱۳۶۲ھ ـ مئی ۱۹۴۳ء ـ جلد ۲۲ عدد ۵

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر گیلانی الیکٹرک پریس، ہسپتال روڈ لاہور میں طبع ہو کر

دفتر ترجمان القرآن، دارالاسلام متصل پٹھان کوٹ سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خیالات کی پراگندگی کا ایک دور وہ ہوتا ہے جب انسان کے سامنے کوئی نصب العین واضح نہیں ہوتا اور وہ بچوں کی طرح ان بہت سے مختلف مقاصد پر جھپٹ مارتا رہتا ہے جو اندھیرے میں اس کو جگنوؤں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔ ہر مقصد کی چمک تھوڑی دیر کے لیے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور قبل اس کے کہ وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھائے ایک دوسرا مقصد چمک اٹھتا ہے حتیٰ کہ اس کی فکر اس فیصلہ میں حیران ہو کر رہ جاتی ہے کہ ان بے شمار مطلوبوں میں سے کونسا مطلوب ایسا ہے جس کے پیچھے وہ اپنی سعی وجہد کی ساری قوتوں کے ساتھ لگ جائے۔ پھر جب ایک نصب العین واضح طور پر متعین ہو جاتا ہے اور نگاہیں اچھی طرح اس پر جم جاتی ہیں تو اس نوعیت کی پراگندہ خیالی ختم ہو جاتی ہے اور ایک دوسری نوعیت کی پراگندہ خیالی کا دور شروع ہوتا ہے جو صحیح اقدامِ عمل کے لیے پہلے دور سے کچھ کم رہزن ثابت نہیں ہوتا۔ اِس دَور میں آدمی کے خیالات کو پریشان کرنے والا سوال یہ نہیں ہوتا کہ وہ کس چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے اُسے کس طرح حاصل کرے۔ کچھ راہ و رسمِ منزل سے ناآشنائی، کچھ مقصود تک جلدی پہنچ جانے کی بےتابی، کچھ ابتدائی مراحل کی بے مزہ خشکی، کچھ نشاناتِ راہ کا دھندلا پن، کچھ منزل کی دوری اور راستہ کی مزاحمتوں کا احساس، غرض بہت سی چیزیں سوچنے والے دماغوں اور اقدام کی خواہش رکھنے والے دلوں کو پریشان کرنے لگتی ہیں اور ان کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مقصد کی طرف اقدام کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ بعض لوگ تدریجی پیش قدمی کو چھوڑ کر جست لگانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بعض دور دراز کی خیالی تجویزوں میں اُلجھنے لگتے ہیں۔ بعض ابتدائی مراحل کے بجائے آخری مراحل کی فکر میں گھلنا شروع کر دیتے ہیں۔ بعض خام کارانہ تجربوں میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ بعض عملی مسائل کے بجائے علمی و نظری بحثوں میں کھوئے جاتے ہیں۔ اور بعض سوچتے سوچتے پریشان ہو کر خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔ پہلے دور کی طرح یہ دور بھی ختم ہونے کے لیے کافی وقت لیتا ہے اور جب تک یہ بھی بخیر و خوبی ختم نہ ہو جائے عمل کی طرف پیش قدمی مشکل ہوتی ہے

عام مسلمانوں کے متعلق تو ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ وہ پہلے دور سے نکل آئے ہیں اور دوسرے دور سے گذر رہے ہیں، البتہ اپنے ہم خیال گروہ کے باب میں میرا تجربہ و مشاہدہ یہ ہے کہ اس وقت ان کا حال یہی ہے۔ جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے ان کے لیے رات کی تاریکی دور ہو چکی ہے۔ مقاصد کے جگنو چمکنے بند ہو گئے ہیں۔ ایک مقصد پوری روشنی میں ان کے سامنے آگیا ہے اور اس پر ان کی نظر اچھی طرح جم گئی ہے۔ وہ جان چکے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کے لیئے دین حق کی اقامت کے سوا اور کوئی مقصدِ زندگی نہیں ہے۔ اس معاملہ میں اگر کوئی شک وریب اور تذبذب پہلے تھا بھی تو وہ اب بالکل دور ہو چکا ہے اور دل و دماغ اس نصب العین کی راہ میں اپنی پوری بازی لگا دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہ عزم و فیصلہ پہلے دور پر اختتام کی آخری مہر ہے۔ مگر اب تمام علامات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ دوسرا دور اپنی ساری پراگندہ خیالیوں کے ساتھ ان پر طاری ہے۔ فکریں ہر طرف سے سمٹ کر اس سوال پر مرکوز ہو گئی ہیں کہ ادیانِ باطلہ کی گرفت جس نے پوری زندگی کو اپنے شکنجہ میں کس رکھا ہے کیسے ہٹائی جائے، عبدیت کو اللہ کے لیے خالص کر دینے میں جو مزاحمتیں حائل ہیں انھیں کیسے دور کیا جائے، اور دین حق کو زمین پر اور خود اپنی حیاتِ دنیا کے تمام شعبوں پر کس طرح قائم کیا جائے۔ یہ سوال ہر اس شخص کو پریشان کر رہا ہے جو اس نصب العین کو قبول کر چکا ہے اور اس کی تفصیلات ایک اچھی خاصی بھول بھلیاں بن گئی ہیں جن کی پیچیدگیوں میں دماغ بڑی طرح بھٹک رہے ہیں۔ کچھ لوگ حیران ہیں کہ اتنا بڑا مقصد اتنی شدید مزاحمتوں کے علی الرغم آخر کیسے حاصل ہوگا؟ کچھ لوگ مزاحم طاقتوں میں سے کسی ایک طاقت سے جس کی اہمیت ان کی نگاہ میں دوسری مزاحمتوں کی بہ نسبت زیادہ ہے، فوراً ٹکرا جانا چاہتے ہیں اور اسی تصادم کے نقشے بنا رہے ہیں۔ کچھ لوگ بیچ کے تمام مراحل کو بیک جنبشِ خیال پھلانگ جاتے ہیں اور بالکل آخری مرحلے میں جو کچھ ہونا چاہیے اس کی تیاری ابھی سے کر ڈالنا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسی ایسی عجیب تجویزوں سے اپنے اور دوسروں کے دماغ کو پریشان کر رہے ہیں جن میں سے کسی ایک کا بھی اگر تجربہ کر ڈالا جائے تو انشاء اللہ پھر کسی دوسرے تجربہ کا موقع ہی باقی نہ رہے۔ کچھ لوگ مرحلۂ اول سے لے کر آخری مرحلہ تک پورا پروگرام مفصل ٹائم ٹیبل کے ساتھ مانگتے ہیں تاکہ انھیں ٹھیک وہ تاریخ معلوم ہو جائے جب خلیفۂ راشد کا انتخاب ہوگا۔ کچھ لوگ مسائل کے عملاً پیش آنے سے پہلے ان کی علمی و نظری تفصیلات پر اس طرح گرماگرم بحثیں شروع کر دیتے ہیں گویا آج ہی انھیں اسلامی حکومت کے کسی محکمہ یا وزارت کا

چارج لیناپٹ یا تاسیسِ خلافت کی کمیٹی کا اجلاس سر پر آگیا ہے، اور دستور کا مسئلہ اب طے ہی کرنا پڑے گا۔ کچھ لوگ کتابی دنیا میں مقیم ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو نقشے انھوں نے صفحۂ قرطاس پر کہیں دیکھے ہیں وہی عالم آب و گل میں ہو بہو نظر آجائیں، وہی کتابی شخصیتیں گوشت پوست کی دنیا میں جلوہ گر ہوں، وہی ان کا طریق کار ہو اور وہی ان کے اثرات اور نتائج عمل ہوں جن کی تصویر سوانح نگار کا قلم کہیں کھینچ گیا ہے۔ کچھ اور لوگ ہیں جو بار بار کہتے اور سوچتے ہیں کہ "کچھ ہونا چاہیے" مگر خود نہیں جانتے کہ کیا ہونا چاہیے۔ یہ صورت حال ڈیڑھ سال سے مسلسل دیکھ رہا ہوں اور اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے ہم خیال لوگوں پر دوسرے ذہن کی پراگندہ خیالی کا دورہ پوری قوت کے ساتھ پڑ چکا ہے۔

عملی قوتوں کے لیئے ذہنی انتشار سے بڑا دشمن کوئی نہیں ہے۔ مگر اس کا صحیح علاج یہ نہیں ہے کہ لوگ سوچنا چھوڑ دیں اور بس کسی کے احکام کی تعمیل کرنے لگیں۔ اس طرح کا عمل انسانوں کا نہیں حیوانوں کا خاصہ ہے اور وہ شخص خود اپنے نصب العین کے ساتھ دشمنی کرتا ہے جو افراد کو عمل بلا فکر اور اطاعتِ بلا فہم کی مشق کراتا ہے۔ انتشار ذہنی کے سبب سے عملی قوتوں پر جو فالج گرا ہو اس کا اصلی علاج یہ ہے کہ بر وقت صحیح فکری رہنمائی کی جائے تاکہ دماغ غلط راہوں پر سوچنے کے بجائے صحیح راہ پر سوچنے لگیں اور پوری طرح یکسو ہو کر اس طرز پر کام کرنے کا فیصلہ کریں جس کے صحیح ہونے کا انھیں اطمینان حاصل ہو جائے۔ اس علاج کی ضرورت اگرچہ بہت پہلے سے محسوس ہو رہی تھی لیکن مرض کی پوری علامات ظاہر ہونے اور شدت کی ایک خاص حد کو پہنچ جانے سے پہلے دوا کا استعمال اکثر غیر مفید ثابت ہوتا ہے اس لیے ناگزیر تھا کہ صبر کے ساتھ اس صورتِ حال کو اس وقت تک دیکھا جاتا رہے جب تک کہ علاج کے لیے مناسب موقع نہ آجائے۔ اب میرا اندازہ ہے کہ وہ موقع آگیا ہے جس کا انتظار تھا اس لیے ان صفحات میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کا ایک سلسلہ شروع کر رہا ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق و ہدایت شاملِ حال رہی تو امید ہے کہ یہ سلسلہ آئندہ چند مہینوں تک برابر جاری رہے گا اور طریقِ عمل کے باب میں ویسا ہی اطمینان بخش ثابت ہوگا جیسا اس سے پہلے ایک اور سلسلۂ مضامین مقصد کے باب میں ثابت ہو چکا ہے۔

کسی مقصدِ عظیم کے لیے جدوجہد شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ وہ افراد تیار ہوں جو اس جدوجہد کے لیے صحیح قسم کے حامل بن سکیں۔ اس کے بعد دوسری ضرورت یہ ہے کہ ان افراد کے درمیان ایسا نظم قائم ہو جو ان کو ایک جسم کے اعضا کی طرح باہم پیوستہ کر دے اور جس میں ان کی انفرادی قوتیں ایک مقصد کی راہ میں اپنے اپنے حصہ کا کام خوبی کے ساتھ انجام دینے لگیں۔ تیسری ضرورت یہ ہے کہ جدوجہد جس میدان میں کی جاتی ہے اس کا پورا جائزہ لے کر میدانِ جنگ کی طرح نقشہ بنا لیا جائے جس میں یہ بات معلوم و متعین ہو کہ ہمیں اپنے مقصد کی طرف جانے کے لیے کن کن پہلوؤں سے پیش قدمی کرنی ہے اور ہر پہلو میں کیا کام کس طرح انجام دینا ہے۔ یہ تینوں امور ہر جدوجہد کے لیے لازمی مقدمات کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے متحقق ہونے سے پہلے کوئی عملی اقدام ممکن نہیں ہے۔ اس لیے میں آئندہ صحبتوں میں ان پر اسی ترتیب کے ساتھ گفتگو کروں گا۔ اگرچہ اس سے پہلے ان ساری چیزوں کی طرف مجمل اشارے کرتا رہا ہوں لیکن اب زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا کہ اولاً ہم کو اپنے مقصد کے لیے کن صفات اور کس سیرت کے افراد درکار ہیں اور ایسے افراد کی تیاری کا طریقہ کیا ہے، ثانیاً ہمارا مقصد اپنی تکمیل کے لیے کس قسم کا اجتماعی نظام چاہتا ہے اور جماعتی نظم کی صحت بحال رکھنے کے لیے جو ہدایات ہم کو دی گئی ہیں ان کو کس طرح عمل میں لایا جائے، ثالثاً اپنے نصب العین کے لیے ہماری جدوجہد کا نقشہ کیا ہے، ابتداءً کن کن پہلوؤں میں ہمیں پیش قدمی کرنی ہے، ہر پہلو میں کام کرنے کے لیے کن صفات کے آدمی موزوں ہو سکتے ہیں، اور ہر پہلو کے کام کا کیا طریقہ ہے۔

یہ بات پہلے ہی اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہم اپنی جدوجہد کے جس مرحلے پر ہوں، اس میں ہم کو اپنی ساری گفتگو اسی مرحلہ تک یا زیادہ سے زیادہ بعد کے مرحلہ کے مبادی تک محدود رکھنی چاہیے۔ ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ ہمیں کہاں جانا ہے، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے لیے صحیح سمتِ سفر کیا ہے اور کسی حد تک قیاس و فکر کی مدد سے مجملاً یہ بھی جان سکتے ہیں کہ پہلے قدم سے لے کر آخری منزل تک کن کن مرحلوں سے ہمیں گزرنا ہو گا۔ لیکن کوئی بڑے سے بڑا صاحبِ بصیرت انسان بھی تفصیل کے ساتھ یہ نہیں جان سکتا کہ اس کی جدوجہد کس طرح ان بہت سے مراحل سے گذرے گی، ان میں کس قسم کے ذرائع اور کس قسم کے مواقع اس کے لیے پیدا ہوں گے اور ان سے فائدہ اٹھا کر اسے کیا کام کس طرح کرنا ہو گا۔ ان

امور کا صحیح علم صرف اللہ ہی کو ہے اور اسی کی مشیت پر ان کا انحصار ہے۔ اس لیے ان کے بارے میں زیادہ سوچنا محض ایک لاحاصل دماغ سوزی ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ صحیح مقصد کے لیے صحیح سمت سفر معلوم کریں اور پھر جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ بہتر تیاری کے ساتھ راہِ راست کے پہلے مرحلے میں قدم رکھ دیں۔ اگر اپنی حد وسع تک ہم نے پہلے مرحلہ کے مقتضیات کو سمجھنے اور انھیں پورا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کی تو یقیناً دوسرا مرحلہ آنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ ہم کو اتنی روشنی عطا فرما دے گا کہ ہم اس کے نشانات راہ کو صاف دیکھنے لگیں گے اور اس میں کامیابی کے جو مواقع سامنے آئیں گے انھیں سمجھ کر ان سے صحیح فائدہ اٹھا سکیں گے۔ غیر مومن کو تو اس معاملہ میں مجبوراً دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے اس لیے کہ اس کا کوئی مولیٰ نہیں جس پر وہ اعتماد کر سکے، مگر مومن کو توکل کے لیے ایک بہت بڑے ولی کارساز کا سہارا حاصل ہے جس کے اعتماد پر وہ بڑے سے بڑے مقصد کے لیے کم سے کم سامان کے ساتھ سخت سے سخت مایوس کن حالات میں بھی پیش قدمی کر سکتا ہے جبکہ بظاہر حساب لگانے سے کامیابی کا ایک فی لاکھ امکان بھی نظر نہ آتا ہو۔ اسے تو بس اپنے آج کے فرض سے سروکار ہوتا ہے اور وہ پورے اطمینان کے ساتھ وہ خدمت انجام دینے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے جس کا سروسامان آج اس کے مالک نے بہم پہنچا دیا ہے۔ رہا کل تو اس کے لیے آج اسے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جتنی اور جیسی خدمت کے ذرائع اور مواقع کل اس کا مالک پیدا کر دے گا اس کو انجام دینے کے لیے وہ مستعد رہے گا۔ جس چیز کی بازپرس اس سے ہونی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ تو نے ذرائع اور مواقع پیدا کیوں نہیں کیے، بلکہ صرف یہ ہے کہ جو ذرائع اور مواقع تجھے دیے گئے تھے ان سے تو نے کتنا کام لیا۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۸)

تحالف قائم کر لیا۔ بعد میں چار مزید ریاستیں الگ ہو کر اس جتھے میں آملیں۔ نیز چھ ریاستوں کی رائے عام یہ تھی کہ اصولاً ہر ریاست کو الگ ہو جانے کا حق حاصل ہے اور وفاقی حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ انھیں زبردستی ممالکِ متحدہ کے وفاق میں واپس آنے پر مجبور کرے۔ لیکن اس کے باوجود ۱۸۶۱ء میں وفاقی حکومت نے ان ریاستوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور تین چار سال کی شدید خونریزی کے بعد انھیں پھر اتحاد میں شریک ہونے پر مجبور کر دیا۔

افتراق بعد اتصال کے خلاف بالعموم تمام اجتماعی نظام اور بالخصوص سیاسی و فوجی نوعیت کے نظام یہ سخت کارروائی جو کرتے ہیں اس کے حق میں قوی ترین دلیل یہ ہے کہ جماعتی نظم اپنی کامیابی کے لیے فطرۃً استحکام کا مقتضی ہوتا ہے اور یہ استحکام سراسر اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ جماعتی نظم جن عناصر کے ملاپ سے وجود میں آئے ان کے ملاپ پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہو۔ ایسے ناقابلِ اعتماد، متزلزل اور انتشار پذیر عناصر کا اتصال جن کے ملے رہنے پر بھروسہ نہ کیا جا سکے اور جن کے ثابت قدم رہنے کا یقین نہ ہو، کبھی کوئی صحیح قسم کی جماعتی زندگی پیدا نہیں کر سکتا۔ خصوصاً جو اجتماعی ادارہ تمدن کی اہم خدمات کا بار اٹھانے والا ہو وہ تو کبھی اس خطرے کو مول لینے پر آمادہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کی ترکیب ایسے اجزا سے ہو جو ہر وقت پارہ پارہ ہو سکتے ہوں۔ انتشار پذیر اینٹوں اور پتھروں سے بنی ہوئی عمارت ویسے بھی انسانی سکونت کے لیے کوئی قابلِ اطمینان چیز نہیں ہوتی کجا کہ ایک قلعہ جس پر ایک پورے ملک کے امن کا انحصار ہو ایسے بکھر جانے والے اجزا سے بنا ڈالا جائے۔ تفریحی انجمنیں جن کی حیثیت بچوں کے گھروندوں سے زیادہ نہ ہو، افراد کی آزادی کو اپنے جماعتی وجود کے مقابلہ میں ضرور ترجیح دے سکتی ہیں، لیکن کسی بڑے جماعتی مقصد کے لیے جان جوکھوں کا کھیل کھیلنے والے ادارے اس کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ریاست، اور فوج اور وہ پارٹیاں جو سنجیدگی کے ساتھ کسی اہم اجتماعی نصب العین کی خدمت کا پرخطر کام کرنے کے لیے بنی ہوں، اور اسی نوعیت کے دوسرے نظام اس امر پر قطعی مجبور ہیں کہ واپس جانے والوں کے لیے اپنے دروازے بند کر دیں اور اپنے اجزائے ترکیبی کو منتشر ہونے سے باز رکھیں۔ محکم اور قابلِ اعتماد اجزا حاصل کرنے کا اس سے زیادہ کامیاب ذریعہ اور کوئی نہیں ہے کہ آنے والے کو پہلے ہی آگاہ کر دیا جائے کہ یہاں سے جانے کا نتیجہ موت ہے کیونکہ اس طرح کمزور قوتِ فیصلہ رکھنے والے لوگ خود ہی اندر

آنے سے باز رہیں گے۔ اور علیٰ ہذا موجودہ اجزاء کو بگڑنے سے باز رکھنے کا بھی قوی ترین ذریعہ یہی ہے کہ جو اجزاء بگڑنے پیدا ہوں
کریں انھیں کچل ڈالا جائے تاکہ جہاں جہاں علیحدگی کے میلانات پرورش پا رہے ہوں وہاں ان کا خود بخود قلع قمع ہو جائے۔
البتہ یہاں اس حقیقت کو پھر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جماعتی نظم کے لیے اس تدبیر کو صحیح قرار دینے کا مطلب یہ نہیں ہے
کہ ہر جماعتی نظم کے لیے اس تدبیر کا استعمال برحق ہے قطع نظر اس سے کہ وہ بجائے خود صالح ہو یا فاسد۔ یہ چیز حق صرف اس جماعتی نظم
کے لیے ہے جو اپنی ذات میں صالح ہو۔ رہا ایک فاسد نظام، تو جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اس کا وجود بجائے خود ایک ظلم ہے
اور اگر وہ اپنے اجزاء کو سمٹائے رکھنے کے لیے جابرانہ قوت استعمال کرے تو یہ اس سے زیادہ بڑا ظلم ہے۔

(باقی)

تفہیم القرآن

(۱۰)

النساء

(از رکوع ۱۹ تا ختم سورہ)

لوگ تم سے عورتوں کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں[1]، کہو اللہ تمہیں ان کے معاملہ میں فتویٰ دیتا ہے[2] اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سُنائے جا رہے ہیں[3]، یعنی وہ احکام جو اُن یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے[4] اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو یا لالچ کی بنا پر تم خود ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو[5]، اور وہ احکام جو اُن بچوں کے متعلق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے۔[6] اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو، اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ

---

[1] اس کی تصریح نہیں فرمائی گئی کہ عورتوں کے معاملہ میں لوگ کیا پوچھتے تھے۔ مگر آگے چل کر جو فتویٰ دیا گیا ہے اس سے سوال کی نوعیت خود واضح ہو جاتی ہے۔

[2] یہ اصل استفتاء کا جواب نہیں ہے بلکہ لوگوں کے سوال کی طرف توجہ فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اُن احکام کی پابندی پر پھر ایک مرتبہ زور دیا ہے جو سورہ کے آغاز میں یتیم لڑکیوں کے متعلق بالخصوص، اور یتیم بچوں کے متعلق بالعموم ارشاد فرمائے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں یتیموں کے حقوق کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ ابتدائی دو رکوعوں میں ان کے حقوق کے تحفظ کی شدت کے ساتھ تاکید کی جا چکی تھی، مگر اس پر اکتفا نہیں کیا گیا، اب جو معاشرتی مسائل کی گفتگو چھڑی تو قبل اس کے کہ لوگوں کے پیش کردہ سوال کا جواب دیا جاتا، یتیموں کے مفاد کا ذکر بطور خود چھیڑ دیا گیا۔

[3] اشارہ ہے اُس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہوا ہے کہ "اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ....." (سورہ نساء، رکوع ۱)

[4] تَرْغَبُونَ اَنْ تَنْكِحُوهُنَّ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "تم اُن سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے ہو" اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "تم اُن سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے"۔ حضرت عائشہ اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے تھے۔ اگر لڑکی مالدار ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے نکاح کر لیں اور مہر و نفقہ ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے (باقی اگلے صفحہ پر)

کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔

جب ۱۶۱ کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رُخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کرلیں۔ صلح بہرحال بہتر ہے ۱۶۲ نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں ۱۶۳ لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو ۱۶۴ کہ اللہ تمھارے اس طرزِ عمل سے بے خبر نہ ہوگا

(بقیہ صفحہ سابق) فائدہ اُٹھائیں۔ اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اُس سے خود نکاح کرتے تھے اور نہ کسی دوسرے سے اس کا نکاح ہونے دیتے تھے تاکہ اس کا کوئی ایسا سرپرست پیدا نہ ہو جائے جو کل اس کے حق کا مطالبہ کرنے والا ہو۔

۱۶۰ اشارہ ہے ان احکام کی طرف جو اسی سورہ کے پہلے اور دوسرے رکوع میں یتیموں کے حقوق کے متعلق ارشاد ہوئے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۱۶۱ یہاں سے اصل استفتاء کا جواب شروع ہوتا ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے سوال کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص غیر محدود تعداد تک بیویاں کرنے کے لیے آزاد تھا اور ان کثیر التعداد بیویوں کے لیے کچھ بھی حقوق مقرر نہ تھے۔ سورۂ نساء کی ابتدائی آیات جب نازل ہوئیں تو اس آزادی پر دو قسم کی پابندیاں عائد ہو گئیں۔ ایک یہ کہ بیویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دی گئی۔ دوسرے یہ کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے عدل (یعنی مساویانہ برتاؤ) کو شرط قرار دیا گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کسی شخص کی بیوی بانجھ ہے، یا دائم المرض ہے، یا تعلقِ زن و شو کے قابل نہیں رہی ہے اور شوہر دوسری بیوی بیاہ لاتا ہے تو کیا وہ مجبور ہے کہ دونوں کے ساتھ یکساں رغبت رکھے؟ یکساں محبت رکھے؟ جسمانی تعلق میں بھی یکسانی برتے؟ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا عدل کی شرط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کو چھوڑ دے؟ نیز یہ کہ اگر پہلی بیوی خود جدا نہ ہونا چاہے تو کیا زوجین میں اس قسم کا معاملہ ہو سکتا ہے کہ جو بیوی غیر مرغوب ہو چکی ہے وہ اپنے بعض حقوق سے خود دست بردار ہو کر شوہر کو طلاق سے باز رہنے پر راضی کرلے؟ کیا ایسا کرنا عدل کی شرط کے خلاف تو نہ ہوگا؟ یہی وہ سوال ہیں جن کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

۱۶۲ یعنی طلاق و جدائی سے بہتر ہے کہ اس طرح باہم مصالحت کر کے ایک عورت اسی شوہر کے ساتھ رہے جس کے ساتھ وہ عمر کا ایک حصہ گذار چکی ہے۔

۱۶۳ عورت کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے بے رغبتی کے اسباب کو خود محسوس کرتی ہو اور پھر بھی وہ سلوک چاہے جو مرغوب بیوی کے ساتھ ہی برتا جا سکتا ہے۔ مرد کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ جو عورت دل سے اُتر جانے پر بھی اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہو اس کو وہ حد سے زیادہ دبانے کی کوشش کرے اور اس کے حقوق ناقابلِ برداشت حد تک گھٹا دینا چاہے۔

۱۶۴ یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے مرد ہی کے جذبۂ فیاضی سے اپیل کی ہے جس طرح بالعموم ایسے معاملات میں اس کا قاعدہ ہے۔ اس نے مرد کو ترغیب دی ہے کہ وہ بے رغبتی کے باوجود اس عورت کے ساتھ احسان سے پیش آئے جو بہرحال اس کی (باقی اگلے صفحہ پر)

بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمھارے بس میں نہیں ہے، تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا (قانونِ الٰہی کا منشا پورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو اُدھر لٹکتا چھوڑ دو۔[۲] اگر تم اپنا طرزِ عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[۳] لیکن اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا، اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انھیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔ لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو، آسمان و زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ

(بقیہ سابق) رفیقِ زندگی رہ چکی ہے اور اُس خدا سے ڈرے جو اگر کسی انسان کی خامیوں کے سبب سے اپنی نظرِ التفات اس سے پھیر لے اور اس کے نصیب میں کمی کرنے پر اُتر آئے تو پھر اس کا دنیا میں کہیں ٹھکانا نہ رہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] مطلب یہ ہے کہ آدمی تمام حالات میں تمام حیثیتوں سے دو یا زائد بیویوں کے درمیان مساوات نہیں برت سکتا۔ ایک خوبصورت ہے اور دوسری بدصورت، ایک جوان ہے اور دوسری سن رسیدہ، ایک دائم المرض ہے اور دوسری تندرست، ایک بد مزاج ہے اور دوسری خوش مزاج، اور اسی طرح کے دوسرے تفاوت بھی ممکن ہیں جن کی وجہ سے ایک بیوی کی طرف طبعاً آدمی کی رغبت کم اور دوسری کی طرف زیادہ ہو سکتی ہے۔ ایسی حالتوں میں قانون یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ محبت و رغبت اور جسمانی تعلق میں ضرور ہی دونوں کے درمیان مساوات رکھی جائے، بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جب تم بے رغبتی کے باوجود ایک عورت کو طلاق نہیں دیتے اور اس کو اپنی خواہش یا خود اس کی خواہش کی بنا پر بیوی بنائے رکھتے ہو تو اس سے کم از کم اس حد تک تعلق ضرور رکھو کہ وہ عملاً بے شوہر ہو کر رہ جائے۔ ایسے حالات میں ایک بیوی کی بہ نسبت دوسری کی طرف میلان زیادہ ہونا تو فطری امر ہے لیکن ایسا بھی نہ ہونا چاہیے کہ دوسری یوں معلق ہو جائے گویا کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن ایک طرف عدل کی شرط کے ساتھ تعددِ ازواج کی اجازت دیتا ہے اور دوسری طرف عدل کو ناممکن قرار دے کر اس اجازت کو عملاً منسوخ کر دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نتیجہ نکالنے کے لیے اس آیت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا گیا ہوتا کہ "تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے" تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا، مگر اس کے بعد ہی جو یہ فرمایا گیا کہ "لہٰذا ایک بیوی کی طرف بالکل نہ جھک پڑو"، اس فقرے نے کوئی موقع اُس مطلب کے لیے باقی نہیں چھوڑا جو مسیحی یورپ کی تقلید کرنے والے حضرات اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔

[۲] یعنی اگر حتی الامکان تم قصداً ظلم نہ کرو اور انصاف ہی سے کام لینے کی کوشش کرتے رہو تو فطری مجبوریوں کی بنا پر جو تھوڑی بہت کوتاہیاں تم سے انصاف کے معاملہ میں صادر ہوں گی انھیں اللہ معاف فرما دے گا۔

ہے اور وہ بے نیاز ہے، ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور کارسازی کے لیے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے، اور وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو شخص محض ثوابِ دنیا کا طالب ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس ثوابِ دنیا بھی ہے اور ثوابِ آخرت بھی، اور اللہ سمیع و بصیر ہے۔[۱] ع ۱۹

[۱] بالعموم قانونی احکام بیان کرنے کے بعد اور بالخصوص تمدن و معاشرت کے اُن پہلوؤں کی اصلاح پر زور دینے کے بعد جن میں انسان اکثر ظلم کا ارتکاب کرتا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس قسم کے چند پُر اثر جملوں میں ایک مختصر وعظ ضرور فرمایا کرتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نفوس کو ان احکام کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ اوپر چونکہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ انصاف اور حسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے لہٰذا اس کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ چند باتیں اہلِ ایمان کے ذہن نشین کر دی جائیں۔

ایک یہ کہ تم کبھی اس بھلاوے میں نہ رہنا کہ کسی کی قسمت کا بنانا اور بگاڑنا تمہارے ہاتھ میں ہے، اگر تم اُس سے ہاتھ کھینچ لو گے تو اس کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔ نہیں، تمہاری اور اس کی، سب کی قسمتوں کا مالک اللہ ہے اور اللہ کے پاس اپنے کسی بندے یا بندی کی مدد کا ایک تم ہی واحد ذریعہ نہیں ہو۔ اس مالکِ زمین و آسمان کے ذرائع بے حد وسیع ہیں اور وہ اپنے ذرائع سے کام لینے کی حکمت بھی رکھتا ہے۔

دوسرے یہ کہ تمہیں اور تمہاری طرح پچھلے تمام انبیاء کی امتوں کو ہمیشہ یہی ہدایت کی جاتی رہی ہے کہ خدا ترسی کے ساتھ کام کرو۔ اس ہدایت کی پیروی میں تمہاری اپنی فلاح ہے، خدا کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم اس کی خلاف ورزی کرو گے تو پچھلی امتوں نے نافرمانیاں کر کے خدا کا کیا بگاڑ لیا ہے جو تم بگاڑ سکو گے۔ اُس فرمانروائے کائنات کو نہ پہلے کسی کی پروا تھی نہ اب تمہاری پروا ہے۔ اس کے امر سے انحراف کرو گے تو وہ تم کو ہٹا کر کسی دوسری قوم کو سربلند کر دے گا اور تمہارے ہٹ جانے سے اس کی سلطنت کی رونق میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

تیسرے یہ کہ خدا کے پاس دنیا کے فائدے بھی ہیں اور آخرت کے فائدے بھی، عارضی اور وقتی فائدے بھی ہیں، پائیدار اور دائمی فائدے بھی۔ اب یہ تمہارے اپنے ظرف اور حوصلے اور ہمت کی بات ہے کہ تم اُس سے کس قسم کے فائدے چاہتے ہو۔ اگر تم محض دنیا کے چند روزہ فائدوں ہی پر ریجھتے ہو اور ان کی خاطر ابدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو تو خدا یہی کچھ تم کو یہیں اور ابھی دے دے گا مگر پھر آخرت کے ابدی فائدوں میں تمہارا کوئی حصہ نہ رہے گا۔ دریا تو تمہاری کھیتی کو ابد تک سیراب کرنے کے لیے تیار ہے مگر یہ تمہارے اپنے ظرف کی تنگی اور حوصلہ کی پستی ہے کہ صرف ایک فصل کی سیرابی کو ابدی خشک سالی کی قیمت پر خریدتے ہو۔ کچھ ظرف میں وسعت ہو تو اطاعت و بندگی کا وہ راستہ اختیار کرو جس سے دنیا اور آخرت دونوں کے فائدے تمہارے حصہ میں آئیں۔

آخر میں جو یہ فرمایا کہ اللہ سمیع و بصیر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اندھا اور بہرا نہیں ہے کہ کسی (باقی اگلے صفحہ پر)

اے ایمان لانے والو! انصاف کے علمبردار[1] اور خدا واسطے کے گواہ بنو[2] اگرچہ تمھارے انصاف اور تمھاری گواہی کی زد خود تمھاری اپنی ذات پر یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، بہرحال اللہ دونوں سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ تم اس کا لحاظ کرو، لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

اے ایمان لانے والو! ایمان لاؤ[3] اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا[4] وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔ رہے

(بقیہ سابق) شاہ بے خبری کی طرح اندھا دھند کام کرے اور اپنی عطا و بخشش میں بھلے اور بُرے کے درمیان کوئی تمیز نہ کرے۔ وہ پوری باخبری کے ساتھ اپنی اس کائنات پر فرماں روائی کر رہا ہے، ہر ایک کے ظرف اور حوصلے پر اس کی نگاہ ہے، ہر ایک کے اوصاف کو وہ جانتا ہے، اسے خوب معلوم ہے کہ تم میں سے کون کس راہ میں اپنی محنتیں اور کوششیں صرف کر رہا ہے۔ تم اس کی نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے اُن بخششوں کی امید نہیں کر سکتے جو صرف فرماں برداروں ہی کے لیے مخصوص ہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو، بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بنو۔ تمھارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمھیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمھارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم ہو۔

[2] یعنی تمھاری گواہی محض خدا کے لیے ہونی چاہیے، کسی کی رو رعایت اس میں نہ ہو، کوئی ذاتی مفاد یا خدا کے سوا کسی کی خوشنودی تمھارے مدنظر نہ ہو۔

[3] ایمان لانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آدمی انکار کے بجائے اقرار کی راہ اختیار کرے، نہ ماننے والوں سے الگ ہو کر ماننے والوں میں شامل ہو جائے۔ ایمان کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو مانے اسے سچے دل سے مانے، پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ مانے، اپنی فکر کو، اپنے مذاق کو، اپنی پسند کو، اپنے رویّے اور چلن کو، اپنی دوستی اور دشمنی کو، اپنی سعی و جہد کے مصرف کو بالکل اُس عقیدے کے مطابق بنالے جسے ماننے کا وہ دعویٰ کر رہا ہے۔ پس اس آیت میں خطاب اُن تمام مسلمانوں سے ہے جو پہلے معنی کے لحاظ سے "ماننے والوں" میں شمار ہوتے ہیں اور مطالبہ ان سے یہ کیا گیا ہے کہ دوسرے معنی کے لحاظ سے سچے مومن بنیں۔

[4] کفر کرنے کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی صاف صاف انکار کر دے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ زبانی (باقی اگلے صفحہ پر)

وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے[1]، تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی ان کو راہِ راست دکھائے گا۔ اور جو منافق اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انھیں یہ مژدہ سنادو کہ ان کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت[2] کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جارہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جارہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو[3]۔ یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے۔ یہ منافق تمہارے معاملہ میں انتظار کر رہے ہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، اگر فتح تمہاری ہوئی تو آکر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلہ بھاری

(بقیہ سابق) آدمی زبان سے مانے اور دل سے نہ مانے، یا اپنے رویّے سے ثابت کردے کہ وہ جس چیز کو ماننے کا دعویٰ کر رہا ہے فی الواقع اسے نہیں مانتا۔ یہاں کفر سے یہ دونوں معنی مراد ہیں اور آیت کا مقصود لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ اسلام کے ان اساسی عقیدوں کے ساتھ کفر کی ان دونوں اقسام میں سے جس قسم کا برتاؤ بھی آدمی اختیار کرے گا، اس کا نتیجہ حق سے دوری اور باطل کی راہوں میں سرگشتگی و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے دین محض ایک غیر سنجیدہ تفریح ہے، ایک کھلونا ہے جس سے وہ اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں۔ جب فضائے دماغی میں ایک لہر اُٹھی، مسلمان ہوگئے اور جب دوسری لہر اُٹھی، کافر بن گئے۔ یا جب فائدہ مسلمان بن جانے میں نظر آیا، مسلمان بن گئے اور جب معبودِ منفعت نے دوسری طرف جلوہ دکھایا تو اس کی پوجا کرنے کے لیے بے تکلف اسی طرف چلے گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔ اور یہ جو فرمایا کہ "پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص محض کافر بن جانے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کے بعد دوسرے لوگوں کو بھی اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرے، اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ تدبیریں شروع کردے اور اپنی قوت اس سعی وجہد میں صرف کرنے لگے کہ کفر کا بول بالا ہو اور اس کے مقابلہ میں اللہ کے دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے۔ یہ کفر میں مزید ترقی، اور ایک جرم پر پے در پے جرائم کا اضافہ ہے جس کا وبال بھی مجرّد کفر سے لازماً زیادہ ہونا چاہیے۔

[2] "عزت" کا مفہوم عربی زبان میں اُردو کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے۔ اُردو میں عزت محض احترام اور قدر و منزلت کے معنی میں آتا ہے مگر عربی میں عزت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی بلند اور محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے کہ کوئی اس پر دست درازی نہ کرسکے۔ دوسرے الفاظ میں لفظ "عزت" "ناقابلِ ہتک حرمت" کا ہم معنی ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا ہے[سلہ]
بس اللہ ہی تمھارے اور ان کے معاملہ کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور اس فیصلہ میں اللہ نے کافروں کے لیے
مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔ ع

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انھیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے کسمساتے ہوئے اُٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں[ملہ]۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں۔ نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اُس طرف۔ جسے اللہ نے

(بقیہ سابق) [سلہ] یعنی اگر ایک شخص اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود کافروں کی اُن صحبتوں میں شریک ہوتا ہے جہاں آیاتِ الٰہی کے خلاف کفر بکا جاتا ہے، اور ٹھنڈے دل سے ان لوگوں کو خدا اور رسول کا مذاق اُڑاتے ہوئے سنتا ہے تو اس میں اور ان کافروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [سلہ] ہر زمانہ کے منافقین کی یہی خصوصیت ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں اُن کو یہ اپنے زبانی اقرار اور دائرۂ اسلام میں برائے نام شمولیت کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اور جو فائدے کافر ہونے کی حیثیت سے حاصل ہونے ممکن ہیں ان کی خاطر یہ کفار سے جا کر ملتے ہیں اور ہر طریقہ سے ان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم کوئی متعصب مسلمان نہیں ہیں، نام کا تعلق مسلمانوں سے ضرور ہے مگر ہماری وفاداریاں تمھارے ساتھ ہیں، فکری اور تہذیبی اور ہر طرح کی موافقت تمھارے ساتھ ہے اور کفر و اسلام کی کشمکش میں ہمارا وزن جب پڑے گا تمھارے ہی پلڑے میں پڑے گا۔

[ملہ] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی شخص مسلمانوں کی جماعت میں شمار ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ نماز کا پابند نہ ہو۔ جس طرح تمام دنیوی جماعتیں اور مجلسیں اپنے اجتماعات میں کسی ممبر کے بلاعذر شریک نہ ہونے کو اس کی عدم دلچسپی پر محمول کرتی ہیں اور مسلسل چند اجتماعات سے غیر حاضر رہنے پر اسے ممبری سے خارج کر دیتی ہیں اسی طرح اسلامی جماعت کے کسی رکن کا نماز باجماعت سے غیر حاضر رہنا اس زمانہ میں اس بات کی صریح دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اور اگر وہ مسلسل چند مرتبہ جماعت سے غیر حاضر رہتا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بنا پر سخت سے سخت منافقوں کو بھی اس زمانہ میں پانچوں وقت مسجد کی حاضری ضرور دینی پڑتی تھی کیونکہ اس کے بغیر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار کیے ہی نہ جا سکتے تھے۔ البتہ جو چیز ان کو سچے اہلِ ایمان سے ممیز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ سچے مومن ذوق و شوق سے آتے تھے، وقت سے پہلے مسجدوں میں پہنچ جاتے تھے، نماز سے فارغ ہو کر بھی مسجدوں میں ٹھیرے رہتے تھے، اور ان کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ نماز سے ان کو حقیقی دلچسپی ہے۔ بخلاف اس کے اذان کی آواز سنتے ہی منافق کی جان پر بن جاتی تھی، دل پر جبر کر کے اُٹھتا تھا، اس کے آنے کا انداز صاف غمازی کرتا تھا کہ آ نہیں رہا ہے بلکہ اپنے آپ کو کھینچ کر لا رہا ہے، جماعت ختم ہوتے ہی اس طرح بھاگتا تھا گویا کسی قیدی کو رہائی (اگلے صفحہ پر)

بھٹکا دیا ہو اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے[سہ]۔

اے ایمان لانے والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دیدو؟ یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں[عہ]، ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔ آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ

(بقیہ سابق) سمائی ملی ہے، اور اس کی تمام حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص خدا کے ذکر سے کوئی رغبت نہیں رکھتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) سہ یعنی جس نے خدا کے کلام اور اس کے رسول کی سیرت سے ہدایت نہ پائی ہو، جس کو سچائی سے منحرف اور باطل پرستی کی طرف راغب دیکھ کر خدا نے بھی اسی طرف پھیر دیا ہو جس طرف وہ خود پھرنا چاہتا تھا، اور جس کی ضلالت طلبی کی وجہ سے خدا نے اس پر ہدایت کے دروازے بند اور صرف ضلالت ہی کے راستے کھول دیے ہوں، ایسے شخص کو راہِ راست دکھانا در حقیقت کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ ہدایت کا معاملہ رزق کی طرح ہے۔ جس طرح یہ حقیقت ہے کہ رزق کے تمام خزانے اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، جس انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے اللہ ہی کے ہاں سے ملتا ہے اور اللہ ہر شخص کو اُسی راستہ سے رزق دیتا ہے جس راستے سے وہ خود مانگتا ہے، جو شخص رزقِ حلال کا طالب ہو اور اس کے لیے کوشش کرے اللہ اس کے لیے حلال راستوں کو کھول دیتا ہے اور جتنی اس کی نیت صادق ہوتی ہے اسی نسبت سے حرام کے راستے اس کے لیے بند کر دیتا ہے، اور جو شخص حرام خوری پر تلا ہوا ہوتا ہے اور اسی کے لیے سعی کرتا ہے اس کو حرام ہی کی روٹی ملتی ہے اور اس کے نصیب میں رزقِ حلال لکھ دینا کسی کے بس میں نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں فکر و عمل کی تمام راہیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، کوئی شخص کسی راہ پر بھی اللہ کے اذن اور اس کی توفیق کے بغیر نہیں چل سکتا، البتہ یہ بات کہ کس انسان کو کس راہ پر چلنے کا اذن ملتا ہے اور کس راہ کی رہروی کے اسباب اس کے لیے ہموار کیے جاتے ہیں، اس کا انحصار سراسر اس آدمی کی اپنی طلب اور سعی پر ہے۔ اگر وہ خدا سے لگاؤ رکھتا ہے، سچائی کا طالب ہے، اور خالص نیت سے خدا کے راستے پر چلنے کی سعی کرتا ہے تو اللہ اسی کا اذن اور اسی کی توفیق اسے عطا فرماتا ہے اور اسی راہ پر چلنے کے اسباب اس کے لیے موافق کر دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اور غلط راستوں ہی پر چلنے کی سعی کرتا ہے، اللہ کی طرف سے اس کے لیے ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہی راہیں اس کے لیے کھول دی جاتی ہیں جن کو اس نے آپ اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ ایسے شخص کو غلط سوچنے، غلط کام کرنے اور غلط راہوں میں اپنی قوتیں صرف کرنے سے بچا لینا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنے نصیب کی راہِ راست جس نے خود کھو دی اور جس سے اللہ نے اس کو محروم کر دیا

(باقی اگلے صفحہ پر)

تمھیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدردان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے۔

بدگوئی پر زبان کھولنا اللہ کو پسند نہیں، الّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو، اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے (مظلوم ہونے کی صورت میں اگرچہ تم کو بدگوئی کا حق ہے) لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ، یا کم از کم برائی سے درگزر کرو، تو اللہ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے حالانکہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

(بقیہ سابق) اس کے لیے یہ گم شدہ نعمت کسی کے ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔

اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی وفاداریاں اللہ کے سوا کسی اور سے وابستہ نہ ہوں، اپنی ساری دلچسپیوں اور محبتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کر چکے، کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا ایسا لگاؤ باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اسے قربان نہ کیا جا سکتا ہو۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) شکر کے اصل معنی اعترافِ نعمت یا احسان مندی کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی کا رویہ اختیار نہ کرو بلکہ صحیح طور پر اس کے احسان مند بن کر رہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ خواہ مخواہ تمھیں سزا دے۔

ایک محسن کے مقابلہ میں صحیح احسان مندانہ رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی دل سے اس کے احسان کا اعتراف کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسان مندی کا ثبوت دے۔ انہی تین چیزوں کے مجموعہ کا نام شکر ہے۔ اور اس شکر کا اقتضا یہ ہے کہ اوّلاً آدمی احسان کو اسی کی طرف منسوب کرے جس نے دراصل احسان کیا ہے، کسی دوسرے کو احسان کے شکریہ اور نعمت کے اعتراف میں اس کا حصہ دار نہ بنائے۔ ثانیاً آدمی کا دل اپنے محسن کے لیے محبت اور وفاداری کے جذبہ سے لبریز ہو اور اس کے مخالفوں سے محبت و خلاص اور وفاداری کا ذرہ برابر تعلق بھی نہ رکھے۔ ثالثاً وہ اپنے محسن کا مطیع و فرماں بردار ہو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کے منشاء کے خلاف استعمال نہ کرے۔

اصل میں لفظ "شاکر" استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے "قدردان" کیا ہے۔ شکر جب اللہ کی طرف سے بندے کی جانب ہو تو اس کے معنی "اعترافِ خدمت" یا "قدردانی" کے ہوں گے اور جب بندے کی طرف سے اللہ کی جانب ہو تو اس کو اعترافِ نعمت یا احسان مندی کے معنی میں لیا جائے گا۔ اللہ کی طرف سے بندوں کا شکریہ ادا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ناقدرشناس نہیں ہے، جتنی اور جیسی خدمات بھی بندے اس کی راہ میں بجا لائیں، اللہ کے ہاں ان کی قدر کی جاتی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

18

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے، اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ سب پکے کافر ہیں[۱۸۱] اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انھیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی۔ —— بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں ان کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے[۱۸۲]، اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے[۱۸۳]۔ ع ۲۱

(بقیہ سابق) کسی کی خدمات عالیہ کے انعام سے محروم نہیں رہتیں، بلکہ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ ہر شخص کو اس کی خدمت سے زیادہ صلہ دیتا ہے۔ بندوں کا حال تو یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے کیا اس کی قدر کم کرتے ہیں اور جو کچھ نہ کیا اس پر گرفت کرنے میں بڑی سختی دکھاتے ہیں۔ لیکن اللہ کا حال یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے نہیں کیا ہے اس پر محاسبہ کرنے میں وہ بہت نرمی اور چشم پوشی سے کام لیتا ہے اور جو کچھ کیا ہے اس کی قدر اس کے مرتبے سے بڑھ کر کرتا ہے۔

[۱۸۰] اس آیت میں مسلمانوں کو ایک بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ منافق اور یہودی اور بت پرست سب کے سب اُس وقت ہر ممکن طریقہ سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اس کی پیروی قبول کرنے والوں کو ستانے اور پریشان کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اس نئی تحریک کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں کے اندر نفرت اور غصہ کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس قسم کے جذبات کا طوفان اٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبان کھولنا تمھارے خدا کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم مظلوم ہو اور اگر مظلوم ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اُسے حق پہنچتا ہے، لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ خفیہ ہو یا علانیہ ہر حال میں بھلائی کیے جاؤ اور برائیوں سے درگزر کرو، کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ جس طرح خدا حلیم اور بردبار ہے، سخت سے سخت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے، بڑے سے بڑے قصوروں پر بھی درگزر کیے چلا جاتا ہے، اسی طرح تم بھی عالی حوصلہ اور وسیع الظرف بنو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۸۱] یعنی کافر ہونے میں وہ لوگ جو نہ خدا کو مانتے ہیں نہ اس کے رسولوں کو، اور وہ جو خدا کو مانتے ہیں مگر رسولوں کو نہیں مانتے، اور وہ جو کسی رسول کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے، سب یکساں ہیں۔ ان میں سے کسی کے کافر ہونے میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں۔

[۱۸۲] یعنی جو لوگ خدا کو اپنا واحد الٰہ و رب تسلیم کریں اور اس کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں کی پیروی قبول کریں صرف وہی اپنے اعمال پر اجر کے مستحق ہیں، اور وہ جس درجہ کا عمل صالح کریں گے اسی درجہ کا اجر پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ اہلِ کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر اُن پر نازل کراؤ[1] تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰؑ سے کر چکے ہیں۔ اُس[2] سے تو انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک اِن پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔[3] پھر انھوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا، حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے[4]۔ اس پر بھی ہم نے اِن سے درگذر کیا۔ ہم نے موسیٰ کو صریح فرمان عطا کیا اور اِن لوگوں پر طور کو اُٹھا کر ان سے (اُس فرمان کی اطاعت کا) عہد لیا[5]۔ ہم نے اِن کو حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو[6]۔ ہم نے اِن سے کہا کہ سبت کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے پختہ عہد لیا[7]۔ آخرکار اِن کی عہد شکنی کی وجہ سے

(بقیہ سابق) خدا کی لاشریک الوہیت و ربوبیت ہی تسلیم نہ کی، یا انھوں نے خدا کے نمائندوں میں سے بعض کو قبول اور بعض کو رد کرنے کا باغیانہ طرزِ عمل اختیار کیا، تو ان کے لیے کسی اجر کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے لوگوں کا کوئی عمل خدا کی نگاہ میں قانونی عمل نہیں ہے۔

؎ یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائیں گے ان کا حساب لینے میں اللہ سخت گیری نہیں برتے گا بلکہ ان کے ساتھ بہت زیادہ نرمی اور درگذر سے کام لے گا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۱؎ مدینہ کے یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپ کی رسالت اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو یا ہم میں سے ایک ایک شخص کے نام اوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آجائے کہ یہ محمدؐ ہمارے رسول ہیں، ان پر ایمان لاؤ۔

۲؎ یہاں کسی واقعہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست پیش کرنی مقصود ہے اس لیے ان کی قومی تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طرف سرسری اشارات کیے گئے ہیں۔

۳؎ اس کا ذکر سورہ بقرہ رکوع ۶ میں گذر چکا ہے۔

۴؎ کھلی کھلی نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول مقرر ہو کر مصر پہنچنے کے بعد سے لے کر فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے تک پے در پے ان لوگوں کے مشاہدے میں آچکی تھیں ظاہر ہے کہ سلطنت مصر کی عظیم الشان طاقت کے پنجوں سے جس نے بنی اسرائیل کو چھڑایا تھا وہ کوئی گائے کا بچہ نہ تھا بلکہ اللہ رب العالمین تھا۔ مگر یہ اس قوم کی باطل پرستی کا کمال تھا کہ خدا کی قدرت اور اس کے فضل کی روشن ترین نشانیوں کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکنے کے بعد بھی جب جھکی تو اپنے محسن خدا کے آگے نہیں بلکہ ایک بچھڑے کی مصنوعی مورت ہی کے آگے جھکی۔

۵؎ صریح فرمان سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تختیوں پر لکھ کر دیے گئے تھے۔ سورۂ اعراف رکوع ۱۷ میں اس کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ آئے گا۔ اور عہد سے مراد وہ میثاق ہے جو کوہ طور کے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا، متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں[illegible] ـــــ حالانکہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے اُن پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں ـــــ[illegible] پھر اپنے کفر میں اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا[illegible] اور خود کہا کہ ہم نے مسیح،

(بقیہ سابق) دامن میں بنی اسرائیل کے نمائندوں سے لیا گیا تھا۔ سورہ بقرہ رکوع ۸ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے اور اعراف رکوع ۲۱ میں پھر اس کی طرف اشارہ آئے گا۔

[illegible] بقرہ رکوع ۶۔

[illegible] بقرہ رکوع ۸۔

(حواشی صفحہ ہذا) [illegible] یہودیوں کے اس قول کی طرف سورہ بقرہ رکوع ۱۱ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ تمام باطل پرست جہلاء کی طرح اس بات پر فخر کرتے تھے کہ جو خیالات اور تعصبات اور رسم و رواج ہم نے اپنے باپ دادا سے پائے ہیں اُن پر ہمارا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ کسی طرح ہم اُن سے نہیں ہٹائے جا سکتے۔ جب کبھی خدا کی طرف سے پیغمبروں نے آکر ان کو سمجھانے کی کوشش کی، انھوں نے اُن کو یہی جواب دیا کہ تم خواہ کوئی دلیل اور کوئی آیت لے آؤ، ہم تمہاری کسی بات کا اثر نہ لیں گے، جو کچھ مانتے اور کرتے چلے آئے ہیں وہی مانتے رہیں گے اور وہی کیے چلے جائیں گے۔

[illegible] یہ جملۂ معترضہ ہے۔

[illegible] یہ فقرہ اصل سلسلۂ تقریر سے تعلق رکھتا ہے۔

[illegible] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا معاملہ یہودی قوم میں فی الواقع ذرہ برابر بھی مشتبہ نہ تھا بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے اسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنا دیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت کا بچہ ہے جس کی ولادت معجزے کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اخلاقی جرم کا۔ جب ایک شریف ترین مشہور و معروف مذہبی گھرانے کی بن بیاہی لڑکی گود میں بچہ لیے ہوئے آئی اور قوم کے بڑے اور چھوٹے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر پر ہجوم کرکے آگئے تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمہیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت سے کہا کہ اس بچے سے ہم کیا پوچھیں جو گہوارے میں لیٹا ہوا ہے۔ مگر یکایک وہ بچہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کرکے کہا کہ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ ۔ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۔ "میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے"۔ (سورہ مریم رکوع ۲)۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی تھی جو ولادت مسیح کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سن شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرت مریم پر زنا کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسیٰ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا۔ لیکن جب حضرت موصوف نبوت کے منصب پر ممتاز ہوئے اور آپ نے یہودیوں

(باقی اگلے صفحہ پر)

عیسیٰ ابن مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے[۱۹۰] ـــــ حالانکہ[۱۹۱] فی الواقع انھوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا[۱۹۲]
بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا[۱۹۳]۔ اور جن لوگوں نے اُس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں
مبتلا ہیں، ان کے پاس اس معاملہ میں کوئی علم نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے[۱۹۴]۔ یقیناً انھوں نے مسیح کو قتل نہیں

(بقیہ سابق) ان کی بداعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی، ان کے علماء و فقہاء کو ان کی ریاکاریوں پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے، اور اس پر خطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں اور ہر محاذ پر شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا، تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اُتر آئے، اور اس وقت انھوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہا السلام معاذ اللہ زانیہ ہیں اور عیسیٰ ابن مریم ولد الزنا ہیں، حالانکہ یہ ظالم بالیقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ پس درحقیقت ان کا یہ بہتان کسی حقیقی شبہ کا نتیجہ نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا، بلکہ خالص بہتان تھا جو انھوں نے جان بوجھ کر محض حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے ظلم اور جھوٹ کے بجائے کفر قرار دیا ہے کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا راستہ روکنا تھا نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۹۰] یعنی جرأت مجرمانہ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے تھے اور پھر اس کو اپنی دانست میں قتل کر ڈالا اور فخریہ کہا کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔ اوپر ہم نے گہوارے کے واقعہ کا جو حوالہ دیا ہے اُس پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السلام کی نبوت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ پھر جو روشن نشانیاں انھوں نے حضرت موصوف سے مشاہدہ کیں (جن کا ذکر سورہ آل عمران رکوع ۵ میں گذر چکا ہے) ان کے بعد تو یہ معاملہ بالکل ہی غیر مشتبہ ہو چکا تھا کہ آں جناب اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اس جرم کا ارتکاب اس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہے۔

[۱۹۱] یہ پورا جملہ معترضہ ہے۔

[۱۹۲] یہ آیت تصریح کرتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے جانے سے پہلے اُٹھائے گئے تھے نہ کہ اس کے بعد۔ غالباً پیلاطس کی عدالت میں تو پیشی آپ ہی کی ہوئی تھی، مگر جب وہ سزائے موت کا فیصلہ سنا چکا، اور جب یہودیوں نے مسیح جیسے پاک نفس انسان کے مقابلہ میں ایک ڈاکو کی جان کو زیادہ قیمتی ٹھیرا کر اپنی حق دشمنی و باطل پسندی پر آخری مہر لگا دی، تب اللہ تعالیٰ نے کسی وقت آنجناب کو اٹھا لیا۔ بعد میں یہودیوں نے جس شخص کو صلیب پر چڑھایا وہ آپ کی ذاتِ مقدس

(باقی اگلے صفحہ پر)

کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا[۱۰]۔ اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔ اور اہل کتاب میں سے

(بقیہ سابق) نہ تھی بلکہ کوئی اور شخص تھا جس کو نہ معلوم کس وجہ سے ان لوگوں نے عیسیٰ ابن مریم سمجھ لیا۔ تاہم ان کا جرم اس سے کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس کو انھوں نے کانٹوں کا تاج پہنایا، جس کے منہ پر تھوکا اور جسے ذلت کے ساتھ صلیب پر چڑھایا اس کو وہ عیسیٰ بن مریم ہی سمجھ رہے تھے۔

[۸] یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ معاملہ کس طور پر مشتبہ کیا گیا۔ چونکہ اس باب میں کوئی یقینی ذریعہ معلومات نہیں ہے اس لیے مجرد قیاس و گمان اور افواہوں کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس شبہ کی نوعیت کیا تھی جس کی بنا پر یہودی یہ سمجھے کہ انھوں نے عیسیٰ ابن مریم کو صلیب دی ہے درآں حالیکہ عیسیٰ ابن مریم ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

[۹] اختلاف کرنے والوں سے مراد عیسائی ہیں اور عیسائیوں میں بھی مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر کوئی ایک متفق علیہ قول نہیں ہے بلکہ بیسیوں اقوال ہیں جن کی کثرت خود اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل حقیقت ان کے لیے بھی مشتبہ ہی رہی۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ مسیح نہ تھا بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہی ذلت کے ساتھ صلیب دے رہے تھے اور مسیح وہیں کسی جگہ کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر چڑھایا تو مسیح ہی کو گیا تھا مگر اُن کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی بلکہ اتارے جانے کے بعد ان میں جان تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ انھوں نے صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ اپنے مختلف حواریوں سے ملے اور باتیں کیں۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب کی موت مسیح کے جسم انسانی پر واقع ہوئی اور وہ دفن ہوا مگر الوہیت کی روح جو ان میں تھی وہ اٹھا لی گئی۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوئے اور جسم سمیت اٹھائے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۰] یہ اس معاملہ کی اصل حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ اس میں جزم اور صراحت کے ساتھ جو چیز بتائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت مسیح کو قتل کرنے میں یہودی کامیاب نہیں ہوئے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ اب رہا یہ سوال کہ اٹھا لینے کی کیفیت کیا تھی، تو اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ قرآن نہ اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ اُن کو جسم و روح کے ساتھ کرۂ زمین سے اُٹھا کر آسمانوں پر کہیں لے گیا، اور نہ یہی صاف کہتا ہے کہ انھوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی روح اٹھائی گئی۔ اس لیے نہ تو قطعی طور پر ان میں سے کسی ایک پہلو کی نفی کی جاسکتی ہے اور نہ اثبات۔ لیکن قرآن کے انداز بیان پر غور کرنے سے یہ بات بالکل نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اٹھائے جانے کی نوعیت و کیفیت خواہ کچھ بھی ہو بہرحال مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ نے کوئی ایسا معاملہ ضرور کیا ہے جو غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ اس غیر معمولی پن کا اظہار تین چیزوں سے ہوتا ہے:

(باقی اگلے صفحہ پر)

(باقی حاشیہ صفحہ سابق)

ایک یہ کہ عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کے جسم و روح سمیت اٹھائے جانے کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور اُن اسباب میں سے تھا جن کی بنا پر ایک بہت بڑا گروہ الوہیت مسیح کا قائل ہوا ہے، لیکن قرآن نے نہ صرف یہ کہ اس کی صاف صاف تردید نہیں کی بلکہ بعینہ وہی رفع (Ascension) کا لفظ استعمال کیا جو عیسائی اس واقعہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کتاب مبین کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کسی خیال کی تردید کرنا چاہتی ہو اور پھر ایسی زبان استعمال کرے جو اس خیال کو مزید تقویت پہنچانے والی ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر مسیح علیہ السلام کا اُٹھایا جانا ویسا ہی اُٹھایا جانا ہوتا جیسا کہ ہر مرنے والا دنیا سے اُٹھایا جاتا ہے، یا اگر اس رفع سے مراد محض درجات و مراتب کی بلندی ہوتی جیسے حضرت ادریس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا، تو اس مضمون کو بیان کرنے کا انداز یہ نہ ہوتا جو ہم یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اس کو بیان کرنے کے لیے زیادہ مناسب الفاظ یہ ہو سکتے تھے کہ "یقیناً انھوں نے مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو زندہ بچا لیا اور پھر طبعی موت دی۔ یہودیوں نے اس کو ذلیل کرنا چاہا تھا مگر اللہ نے اس کو بلند درجہ عطا کیا"۔

تیسرے یہ کہ اگر یہ رفع ویسا ہی معمولی قسم کا رفع ہوتا جیسے ہم محاورہ میں کسی مرنے والے کو کہتے ہیں کہ اُسے اللہ نے اُٹھا لیا تو اس کا ذکر کرنے کے بعد یہ فقرہ بالکل غیر موزوں تھا کہ "اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے"۔ یہ تو صرف کسی ایسے واقعہ کے بعد ہی موزوں و مناسب ہو سکتا ہے جس میں اللہ کی قوتِ قاہرہ اور اس کی حکمت کا غیر معمولی ظہور ہوا ہو۔

اس کے جواب میں قرآن سے اگر کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہ ہے کہ سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے مُتَوَفِّيكَ کا لفظ استعمال کیا ہے (رکوع ۶)۔ لیکن جیسا کہ وہاں ہم حاشیہ میں واضح کر چکے ہیں، یہ لفظ طبعی موت کے معنی میں صریح نہیں ہے بلکہ قبضِ روح اور قبضِ روح و جسم دونوں پر دلالت کر سکتا ہے، لہٰذا یہ اُن قرائن کو ساقط کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ بعض لوگ جن کو مسیح کی طبعی موت کا حکم لگانے پر اصرار ہے، سوال کرتے ہیں کہ توفی کا لفظ قبضِ روح و جسم دونوں پر استعمال ہونے کی کوئی اور نظیر بھی ہے؟ لیکن جب کہ قبضِ روح و جسم کا واقعہ تمام نوعِ انسانی کی تاریخ میں پیش ہی ایک مرتبہ آیا ہو تو اس معنی پر اس لفظ کے استعمال کی نظیر پوچھنا محض ایک بے معنی بات ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا اصل لغت میں اس استعمال کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو ماننا پڑے گا کہ قرآن نے رفعِ جسمانی کے عقیدہ کی تردید کرنے کے بجائے یہ لفظ استعمال کر کے اُن قرائن میں ایک اور قرینہ کا اضافہ کر دیا ہے جن سے اس عقیدہ کو الٹی مدد ملتی ہے، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ موت کے صریح لفظ کو چھوڑ کر وفات کے محتمل المعنیین لفظ کو ایسے موقع پر استعمال کرتا جہاں رفعِ جسمانی کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ایک فاسد اعتقاد یعنی الوہیتِ مسیح کے اعتقاد کا موجب بن رہا تھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

کوئی ایسا نہ ہوگا جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا[سلہ] اور قیامت کے روز وہ اُن پر گواہی دے گا[سلہ]

— غرض ان یہودی بن جانے والوں کے اسی ظالمانہ رویہ کی بنا پر،[سٹلہ] اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے

سے روکتے ہیں،[سٹلہ] اور سود لیتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا تھا،[ھشلہ] اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں،

(بقیہ سابق) پس قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت اگر کوئی طرزِ عمل رکھتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ رفع جسمانی کی تصریح سے بھی اجتناب کیا جائے اور موت کی تصریح سے بھی، بلکہ مسیح علیہ السلام کے اٹھائے جانے کو اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ کا ایک غیر معمولی ظہور سمجھتے ہوئے اس کی کیفیت کو اسی طرح مجمل چھوڑ دیا جائے جس طرح خود اللہ تعالیٰ نے مجمل چھوڑ دیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ اس فقرے کے دو معنی بیان کیے گئے ہیں اور الفاظ میں دونوں کا یکساں احتمال ہے۔ ایک معنی وہ جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں، دوسرے یہ کہ "اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیح پر ایمان نہ لے آئے"۔ اہلِ کتاب سے مراد یہودی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ عیسائی بھی ہوں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مسیح کی طبعی موت جب واقع ہوگی اس وقت جتنے اہلِ کتاب موجود ہوں گے وہ سب ان پر (یعنی ان کی رسالت پر) ایمان لا چکے ہوں گے۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ تمام اہلِ کتاب پر مرنے سے عین قبل رسالتِ مسیح کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور وہ مسیح پر ایمان لے آتے ہیں، مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایمان لانا مفید نہیں ہو سکتا۔ دونوں معنی متعدد صحابہ، تابعین اور اکابر مفسرین سے منقول ہیں اور صحیح مراد صرف اللہ ہی کے علم میں ہے۔

سلہ یعنی جو کچھ ان اہلِ کتاب نے مسیح علیہ السلام اور اس پیغام کے ساتھ کیا جو آپ لائے تھے، اس پر خداوند تعالیٰ کی عدالت میں آپ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

سٹلہ جملۂ معترضہ ختم ہونے کے بعد یہاں سے پھر اصل سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے جو اوپر سے چلا آ رہا ہے۔

سٹلہ یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں، بلکہ اس قدر بے باک مجرم بن چکے ہیں کہ خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو تحریک اٹھتی ہے، اکثر اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ ہی کام کرتا نظر آتا ہے، اور راہِ حق کی طرف بلانے کے لیے جو تحریک شروع ہوتی ہے اکثر اس کے مقابلہ میں یہودی ہی سب سے بڑھ کر مزاحم بنتے ہیں، دراں حالے کہ یہ کم بخت کتاب اللہ کے حامل اور انبیاء کے وارث ہیں۔ ان کا تازہ ترین جرم یہ اشتراکی تحریک ہے جسے یہودی دماغ نے اختراع کیا اور یہودی رہنمائی ہی نے پروان چڑھایا ہے۔ ان نام نہاد اہلِ کتاب کے نصیب میں یہ جرم بھی مقدر تھا کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت خدا کے صریح انکار پر، خدا سے کھلم کھلا دشمنی پر، خدا پرستی کو مٹا دینے کے علی الاعلان عزم و ارادہ پر تعمیر کیا گیا اس کے موجد، مخترع اور بانی و سربراہ کار یہ موسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا ہوں

ہم نے وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں[ســه]، اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے[سلہ]۔ مگر ان میں جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایماندار ہیں وہ سب اس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی[سلا]۔ اس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کرنے والے اور اللہ اور روز آخرت پر سچا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور

(بقیہ سابق) [شه] توراۃ میں بالفاظ صریح یہ حکم موجود ہے کہ :-

"اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔ اگر تو کسی وقت اپنے ہمسایہ کے کپڑے گرو رکھ بھی لے تو سورج کے ڈوبنے تک اس کو واپس کر دینا کیونکہ فقط وہی اس کا ایک اوڑھنا ہے، اس کے جسم کا وہی لباس ہے، پھر وہ کیا اوڑھ کر سوئے گا۔ پس جب وہ فریاد کرے گا تو میں اس کی سنوں گا کیونکہ میں مہربان ہوں" (خروج باب ۲۲: ۲۵-۲۷)

لیکن اس کے باوجود اسی تورات کے ماننے والے یہودی آج دنیا کے سب سے بڑے سود خوار ہیں اور اپنی تنگ دلی و سنگ دلی کے لیے ضرب المثل بن چکے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [سلہ] یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی پاک چیزیں استعمال کرنے کا جو حق ان کو دیا گیا تھا وہ ان کی اس مسلسل بغاوت کی وجہ سے واپس لے لیا گیا۔ اللہ سے بغاوت کر کے اب جو کچھ وہ اس کی زمین میں کھا رہے ہیں حرام کھا رہے ہیں، جن ذرائع سے استفادہ کر رہے ہیں، بلا کسی حق کے کر رہے ہیں۔ اب وہ اللہ کی نگاہ میں خارج از حد قانون (outlaw) ہیں۔

[سلہ] یعنی اس قوم کے جو لوگ ایمان و اطاعت سے منحرف اور بغاوت و انکار کی روش پر قائم رہیں اُن کے لیے خدا کی طرف سے دردناک سزا تیار ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں جو عبرتناک سزا ان کو ملی اور مل رہی ہے وہ کبھی کسی دوسری قوم کو نہیں ملی۔ دو ہزار برس ہو چکے ہیں کہ زمین پر کہیں ان کو عزت کا ٹھکانا میسر نہیں، دنیا میں تتر بتر کر دیے گئے ہیں اور ہر جگہ غریب الوطن ہیں، کوئی دور ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ دنیا کے کسی نہ کسی خطہ میں ذلت کے ساتھ پامال نہ کیے جاتے ہوں اور اپنی دولت مندی کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ پھر غضب یہ ہے کہ قومیں پیدا ہوتی اور مٹتی ہیں مگر اس قوم کو موت بھی نہیں آتی، اس کو دنیا میں لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْییٰ کی سزا دی گئی ہے تاکہ قیامت تک دنیا کی قوموں کے لیے ایک زندہ نمونہ عبرت بنی رہے اور اپنی سرگذشت سے یہ سبق دیتی رہے کہ خدا کی کتاب بغل میں رکھ کر خدا کے مقابلہ میں باغیانہ جسارتیں کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے۔ رہی آخرت تو ان شاء اللہ وہاں کا عذاب اس سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

76

اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ ع ۲۳

اے محمدؐ! ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اُس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔[۲۰۳] ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھیجی۔[۲۰۴] ہم نے داؤد کو زبور دی۔ ہم نے اُن رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور اُن رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ ہم نے موسیٰ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔[۲۰۵] یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے،[۲۰۶] صرف اس لیے کہ ان پیغمبروں کو مبعوث کر دینے کے بعد

(بقیہ سابق) بھی زیادہ دردناک ہوگا۔

[۲۰۲] یعنی ان میں سے جو لوگ کتبِ آسمانی کی حقیقی تعلیم سے واقف ہیں اور ہر قسم کے تعصب، جاہلانہ ضد، آبائی تقلید اور نفس کی بندگی سے آزاد ہو کر اُس امرِ حق کو سچے دل سے مانتے ہیں جس کا ثبوت آسمانی کتابوں سے ملتا ہے ان کی روش کا فرد ظالم یہودیوں کی عام روش سے بالکل مختلف ہے۔ ان کو بیک نظر محسوس ہو جاتا ہے کہ جس دین کی تعلیم پچھلے انبیاء نے دی تھی اسی کی تعلیم قرآن دے رہا ہے اس لیے وہ بے لاگ حق پرستی کے ساتھ دونوں پر ایمان لے آتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۲۰۳] اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انوکھی چیز لے کر نہیں آئے ہیں جو پہلے نہ آئی ہو۔ ان کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں دنیا میں پہلی مرتبہ ایک نئی چیز پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ دراصل ان کو بھی اسی ایک منبعِ علم سے ہدایت ملی ہے جس سے تمام پچھلے انبیاء کو ہدایت ملتی رہی ہے، اور وہ بھی اسی ایک صداقت و حقیقت کو پیش کر رہے ہیں جسے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیدا ہونے والے پیغمبر ہمیشہ سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

[۲۰۴] وحی کے معنی ہیں اشارہ کرنا، دل میں کوئی بات ڈالنا، خفیہ طریقے سے کوئی بات کہنا، پیغام بھیجنا۔

[۲۰۵] دوسرے انبیاء علیہم السلام پر تو وحی اس طرح آتی تھی کہ ایک آواز آ رہی ہے یا فرشتہ پیغام سنا رہا ہے اور وہ سن رہے ہیں۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ خاص معاملہ برتا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان سے گفتگو کی۔ بندے اور خدا کے درمیان اس طرح باتیں ہوتی تھیں جیسے دو شخص آپس میں بات کرتے ہیں۔ مثال کے لیے اس گفتگو کا حوالہ کافی ہے جو سورہ طٰہٰ میں نقل کی گئی ہے۔

[۲۰۶] یعنی ان سب کا ایک ہی کام تھا اور وہ یہ کہ جو لوگ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیم پر ایمان لائیں اور اپنے رویہ کو اس کے مطابق درست کر لیں انہیں فلاح و سعادت کی خوشخبری سنا دیں اور جو فکر و عمل کی غلط راہوں پر چلتے رہیں ان کو اس غلط روی کے بُرے انجام سے آگاہ کر دیں۔

لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے[1] اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ (یہ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں) مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے، اور اس پر ملائکہ بھی گواہ ہیں اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔ جو لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور خدا کے راستہ میں مانع و مزاحم بنتے ہیں وہ یقیناً گمراہی میں حق سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ یقیناً جن لوگوں نے انکار و بغاوت کا طریقہ اختیار کیا اور ظلم و ستم پر اتر آئے اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انہیں کوئی راستہ بجز جہنم کے راستہ کے نہ دکھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

لوگو! یہ رسول تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر آگیا ہے، ایمان لے آؤ، تمہارے ہی لیے بہتر ہے، اور اگر انکار کرتے ہو تو جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے[2] اور اللہ علیم بھی ہے اور حکیم بھی[3]۔

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو[4] اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ

---

[1] یعنی ان تمام پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک ہی غرض تھی، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نوع انسانی پر اتمام حجت کر دے اور آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم خدا کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ آپ نے ہمیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام کیا ہی نہ تھا۔ اسی غرض کے لیے خدا نے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر التعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا بلکہ یا تو خود اس پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا، یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہِ راست معلوم تھی اور انہوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا مگر انہیں آگاہ نہ کیا۔

[2] یعنی زمین و آسمان کے مالک کی نافرمانی کر کے تم اس کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے۔ نقصان جو کچھ ہوگا تمہارا اپنا ہوگا۔

[3] یعنی تمہارا خدا نہ تو بے خبر ہے کہ اس کی سلطنت میں رہتے ہوئے تم شرارتیں کرو اور اسے معلوم نہ ہو، اور نہ وہ نادان ہے کہ اسے اپنے فرامین کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نمٹنے کا طریقہ نہ آتا ہو۔

[4] یہاں اہل کتاب سے مراد عیسائی ہیں اور غلو کے معنی ہیں کسی چیز کی تائید و حمایت میں حد سے (باقی اگلے صفحہ پر)

ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا[1] جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے[2] (جس نے مریم کے رحم میں بچہ کی شکل اختیار کی)۔ پس تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ[3] اور نہ کہو کہ تین ہیں[4]۔ باز آجاؤ، تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی الٰہ ہے۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی

(بقیہ سابق) گذر جانے کے۔ جس طرح یہودیوں کا جرم یہ ہے کہ انھوں نے مسیح علیہ السلام کا انکار کیا اور اس میں حد سے گذر گئے اسی طرح عیسائیوں کا جرم یہ ہے کہ انھوں نے مسیح کو ماننا اور ماننے میں حد سے گذر گئے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اصل میں لفظ کلمہ استعمال ہوا ہے۔ مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مریم علیہا السلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد کے نطفہ سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کر لے۔ عیسائیوں کو ابتداءً تو مسیح علیہ السلام کی پیدائش بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا، مگر انھوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو "کلام" یا "نطق" (Logos) کا ہم معنی سمجھ لیا، پھر اس کلام و نطق سے اللہ تعالیٰ کی وہ صفت مراد لے لی جو ہمیشہ سے اس کی ذاتی صفت ہے، پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السلام کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسدی صورت اختیار کی تھی جو عبارت ہے ذاتِ مسیح سے۔ اس طرح ان کے اندر مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے نطق و کلام کی صفت کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

[2] یہاں خود مسیح کو رُوحٌ مِّنْهُ (خدا کی طرف سے ایک روح) کہا گیا ہے، اور سورہ بقرہ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (ہم نے پاک روح سے مسیح کی مدد کی)۔ دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ روح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا، سراسر حقانیت اور راستبازی، اور از سرتاپا فضیلت اخلاق تھی۔ یہی تعریف آنجناب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی۔ مگر انھوں نے اس میں بھی غلو کیا، روح من اللہ کو عین روح اللہ قرار دے لیا، روح القدس (Holy Ghost) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی روح مقدس تھی جو مسیح کے اندر حلول کر گئی تھی، اور اس طرح انھوں نے اللہ اور مسیح کے علاوہ روح القدس کو تیسرا الٰہ بنا ڈالا۔ یہ ان کا دوسرا زبردست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔

[3] یعنی اللہ کو واحد الٰہ مانو اور تمام رسولوں کی رسالت تسلیم کرو جن میں سے ایک رسول مسیح بھی ہیں۔ یہی مسیح علیہ السلام کی اصلی تعلیم تھی اور یہی امر حق ہے جسے ایک سچے پیرو مسیح کو ماننا چاہیے۔

[4] یعنی تین الٰہوں کے عقیدے کو چھوڑ دو خواہ وہ کسی شکل میں تمہارے اندر پایا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی بیک وقت

(باقی اگلے صفحہ پر)

اس کا بیٹا ہو۔[۱] زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں[۲] اور ان کی کفالت و خبر گیری کے لیے بس وہی کافی

(بقیہ سابق) توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ مسیح علیہ السلام کے صریح اقوال جو اناجیل میں ملتے ہیں ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا بس ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں۔ ان کے لیے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ توحید اصل دین ہے۔ مگر وہ جو ایک غلط فہمی ابتداء میں ان کو پیش آگئی تھی کہ کلمۃ اللہ نے مسیح کی شکل میں ظہور کیا اور روح اللہ نے اس میں حلول کیا، اس کی وجہ سے انھوں نے مسیح اور روح القدس کی الوہیت کو بھی خداوند عالم کی الوہیت کے ساتھ ماننا خواہ مخواہ اپنے اوپر لازم کر لیا۔ اس زبردستی کے التزام سے ان کے لیے یہ مسئلہ ایک ناقابل حل چیستاں بن گیا کہ عقیدۂ توحید کے باوجود عقیدۂ تثلیث کو، اور عقیدۂ تثلیث کے باوجود عقیدۂ توحید کو کس طرح نباہیں۔ تقریباً ۱۸سو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سر کھپا رہے ہیں، بیسیوں فرقے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں، اسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے، اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوتے چلے گئے ہیں، اسی پر ان کے سارے علم کلام کا زور صرف ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی، نہ اس کے بھیجے ہوئے مسیح نے، اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدا تین بھی مانے جائیں اور پھر وحدانیت بھی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف ان کے غلو نے پیدا کیا ہے اور اس کا بس یہی ایک حل ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں، مسیح اور روح القدس کی الوہیت کا تخیل چھوڑ دیں اور صرف اللہ کو الٰہ واحد تسلیم کر لیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہ عیسائیوں کے چوتھے غلو کی تردید ہے۔ بائیبل کے عہد جدید کی روایات اگر صحیح بھی ہوں تو ان سے (خصوصاً پہلی تین انجیلوں سے) زیادہ سے زیادہ بس اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خدا اور بندوں کے تعلق کو باپ اور اولاد کے تعلق سے تشبیہ دی تھی اور "باپ" کا لفظ خدا کے لیے وہ محض مجاز اور استعارہ کے طور پر استعمال کرتے تھے، چنانچہ جس طرح انھوں نے اپنے لیے خدا کو باپ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اسی طرح عام انسانوں کے لیے بھی کیا ہے۔ لیکن عیسائیوں نے یہاں پھر غلو سے کام لیا اور مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا۔ ان کا عجیب و غریب نظریہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیح خدا کا مظہر ہے اور اس کے کلمے اور اس کی روح کا جسدی ظہور ہے اس لیے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے، اور خدا نے اپنے اکلوتے کو زمین پر اس لیے بھیجا کہ انسان کے گناہ اپنے سر لے کر صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسانوں کے گناہ کا کفارہ ادا کرے۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت خود مسیح علیہ السلام کے کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے تخیلات کا آفریدہ ہے اور اس غلو کا نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبر کی عظیم الشان شخصیت سے متأثر ہو کر مبتلا ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارہ کے عقیدے کی تردید نہیں کی ہے کیونکہ عیسائیوں کے ہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے بلکہ مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ ہے اور اس سوال کی ایک صوفیانہ و فلسفیانہ توجیہ ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہے۔[1] ع

مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو، اور نہ مقرب ترین فرشتے اِس کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ اُس وقت وہ لوگ جنھوں نے ایمان لاکر نیک طرزِ عمل اختیار کیا ہے اپنے اجر پورے پورے پائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا، اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے ان کو وہ دردناک سزا دے گا اور خدا کے سوا جن جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔

لوگو! تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس دلیل روشن آگئی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمھیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے اور اس کی پناہ ڈھونڈیں گے ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا اور راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا۔

لوگ تم سے[2] کلالہ[3] کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمھیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد

(بقیہ سابق) جب مسیح خدا کا اکلوتا تھا تو وہ صلیب پر چڑھ کر لعنت کی موت کیوں مرا۔ لہٰذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہوجاتی ہے اگر مسیح کے ابن اللہ ہونے کی تردید کردی جائے اور اس غلط فہمی کو دور کردیا جائے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے تھے۔

[1] یعنی زمین و آسمان کی موجودات میں سے کسی کے ساتھ بھی خدا کا تعلق باپ اور بیٹے کا نہیں ہے بلکہ محض مالک اور مملوک کا تعلق ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] یعنی خدا اپنی خدائی کا انتظام کرنے کے لیے خود کافی ہے، اس کو کسی سے مدد لینے کی حاجت نہیں کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔

[2] یہ آیت اس سورہ کے نزول سے بہت بعد نازل ہوئی ہے۔ بعض روایات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کی سب سے آخری آیت ہے۔ یہ بیان اگر صحیح نہ بھی ہو تب بھی کم از کم اتنا تو ثابت ہے کہ یہ آیت سنہ ۹ ہجری میں نازل ہوئی۔ اور سورۂ نسا اس سے بہت پہلے ایک مکمل سورہ کی حیثیت سے پڑھی جارہی تھی۔ اسی وجہ سے اس آیت کو ان آیات کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

مرجائے اور اس کی ایک بہن ہو[۱] تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی اور اسی طرح بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا۔[۲] اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حقدار ہوں گی[۳] اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا۔ اللہ تمہارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

(بقیہ سابق) سلسلہ میں شامل نہیں کیا گیا جو احکام میراث کے متعلق سورہ کے آغاز میں ارشاد ہوئی ہیں، بلکہ اسے سورہ کے ضمیمہ کے طور پر آخر میں لگا دیا گیا۔

سے۵ کلالہ کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض کی رائے میں کلالہ وہ شخص ہے جو لا ولد بھی ہو اور جس کے باپ اور دادا بھی زندہ نہ ہوں۔ اور بعض کے نزدیک محض لاولد مرنے والے کو کلالہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آخر وقت تک اس معاملہ میں متردد رہے۔ لیکن عامۂ فقہاء نے حضرت ابوبکر کی اس رائے کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس کا اطلاق پہلی صورت پر ہی ہوتا ہے۔ اور خود قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ یہاں کلالہ کی بہن کو نصف ترکہ کا وارث قرار دیا گیا ہے، حالانکہ اگر کلالہ کا باپ زندہ ہو تو بہن کو سرے سے کوئی حصہ پہنچتا ہی نہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہاں ان بھائی بہنوں کی میراث کا ذکر ہو رہا ہے جو میت کے ساتھ ماں اور باپ دونوں میں یا صرف باپ میں مشترک ہوں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک خطبہ میں اس معنی کی تشریح کی تھی اور صحابہ میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا، اس بنا پر یہ مجمع علیہ مسئلہ ہے۔

[۲] یعنی بھائی اس کے پورے مال کا وارث ہوگا اگر کوئی اور صاحب فریضہ نہ ہو۔ اور اگر کوئی صاحب فریضہ موجود ہو، مثلاً شوہر، تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی تمام ترکہ بھائی کو ملے گا۔

[۳] یہی حکم دو سے زائد بہنوں کا بھی ہے۔

مقالات

تغیر کیا ہے؟

از جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی۔ بی، اے

مغربی تعلیم اور اشتراکی پروپگنڈے کے اثر سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ خیال سرعت کے ساتھ پھیل گیا ہے کہ انسان کی خارجی زندگی اور تمدنی ماحول میں جو تبدیلیاں ہر زمانہ میں ہوتی رہتی ہیں ان کی وجہ سے اس کے اخلاقی اصول و نظریات میں بھی تغیر ہونا ضروری ہے چنانچہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے کہ جو مذاہب آج سی صدیوں پیشتر انسانی تمدن و اخلاق کی اصلاح کے لیے وجود میں آئے تھے وہ موجودہ ترقی یافتہ اور تبدیل پذیر حالات کا ساتھ نہیں دے سکتے، کیونکہ یہ مذاہب ایک خاص ماحول میں پیدا ہوئے تھے اور اسی ماحول اور عہد کی ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے، موجودہ زمانہ میں جب کہ حالات بالکل بدل گئے ہیں اور انسانی تمدن ایک نئے ارتقائی دور سے گذر رہا ہے، ان مذاہب کے اخلاقی اور قانونی احکام پر عمل کرنے کی کوشش بے سود اور لایعنی ہے۔ غرض کہ موجودہ زمانہ میں زندگی کے نئے تحرکی (Dynamic) تصورنے ہر قدیم چیز کو ٹھکرا دیا ہے۔ آج کل کسی شے کی قدر و قیمت اس نقطۂ نظر سے متعین نہیں کی جاتی کہ اس میں صداقت کا جز و کتنا ہے، بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ وہ قدیم ہے یا جدید۔ حتیٰ کہ خیر و صداقت کے تصورات کو بھی اضافی قرار دیا جاتا ہے اور انھیں زمانہ کی تبدیلیوں کے تابع سمجھا جاتا ہے۔ اس نئے تحرکی تصور کے پس پشت جو عقیدہ کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی مسلسل اور پیہم انقلاب و تغیر سے گذرتی رہتی ہے اور اس کی فطرت میں عدم تغیر یا ثبات و قرار کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ محض ایک مفروضہ ہے جو حجت و استدلال اور ثبوت کا اسی طرح محتاج ہے جس طرح کوئی دوسرا مفروضہ ہو سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ کوئی شخص یہ دعویٰ لے کر کھڑا ہو کہ "زندگی پیہم انقلاب اور جاوداں تغیر ہے" اسے خود تغیر کی ماہیت پر غور کر کے یہ تحقیق کر لینا چاہیے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات متحقق ہونی چاہیے کہ ہم کو تغیرات کا علم کن ذرائع سے حاصل ہوتا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دیگر حقائق کی طرح تغیرات کا علم بھی ہمیں تجربہ سے حاصل ہوتا ہے؟ لیکن یہ تجربہ کیا شئے ہے جس پر ہماری تمام علمی موشگافیوں اور فلسفہ طرازیوں کا دارومدار ہے؟ کیا اس کا تعلق ماضی سے نہیں ہے؟ اگر ماضی کے حالات وواقعات اور اس کے افکار وتصورات حال اور مستقبل کے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتے تب تو یہ کہنا پڑے گا کہ ہمارے تجربات بالکل ہی بے معنی ہیں۔ کیونکہ تجربہ کا سارا مواد گذشتہ واقعات ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہمارے تعلیم یافتہ اصحاب کے کہنے کے مطابق یہ مان لیا جائے کہ زندگی ان معنوں میں ایک مسلسل تغیر ہے کہ ہر آنے والی حالت گذشتہ حالتوں سے مختلف ہوتی ہے تو یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ انسان آنے والے حالات وواقعات میں اپنے گذشتہ تجربات سے کیونکر فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ ان تجربات کی ترکیب وتشکیل ان احوال وواقعات نے کی ہے جنھیں آنے والی حالتوں سے کوئی ربط وتعلق ہی نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نئے حالات میں عقل ہماری مدد پہ آجاتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود عقل تجربہ کا ایک وظیفہ (Function) ہے کیونکہ اس کو جو کچھ مواد ملتا ہے وہ تجربہ ہی سے ملتا ہے اور تجربہ سے الگ اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کا انفرادی یا معاشرتی تجربہ اسی صورت میں اس کے کام آسکتا ہے جب ہر نئی آنے والی حالت اور گذری ہوئی حالتوں کے درمیان کوئی مماثلت یا یکسانیت موجود ہو ورنہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہر نئے دور یا ہر نئی حالت اور گذشتہ ادوار واحوال میں ایک نوعی فرق واختلاف (Difference of Kind) ہوتا ہے تو پھر اجتماعی اور انفرادی تجربات کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی کیونکہ اس صورت میں تو تجربہ تمام اُن حالات وواقعات سے ماخوذ قرار پائے گا جو نئے حالات سے کوئی مناسبت رکھتے ہی نہیں۔ مثلاً قانون کو لیجیے کہ اس میں گذشتہ نظائر سے کام لے کر نئے پیش آنے والے واقعات پر حکم لگایا جاتا ہے۔ قانونی نظائر سے ہر زمانہ میں کام لیا گیا ہے اور آج بھی لیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر نئی حالت کے لیے فوری طور پر قانون وضع کرنا غیر ممکن ہے۔ گذشتہ حالات وواقعات کی بنیاد پر جو قوانین وضع کیے جا چکے ہیں انھیں نئے حالات پر منطبق کیا[illegible]

ہے اور اس طرح قانون کی تجدید و توسیع ہوتی رہتی ہے۔ اب اگر نئے احوال و واقعات اور اُن گذشتہ حالات کے درمیان کوئی نوعی فرق ہوتا جن پر قانون مبنی ہوا کرتا ہے تو گذشتہ نظائر کا کیا فائدہ ہوتا۔ قانونی نظائر سے کام لینا ہی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ گذشتہ حالات و واقعات اور آئندہ پیش آنے والی حالتوں کے مابین کوئی جوہری اختلاف نہیں ہے۔ اسی مثال پر قیاس کرتے ہوئے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو چیز قانون کے دائرے میں ایک مختصر اور محدود مدت کے لیے صحیح ہے وہی معاشرت اور تمدن کی تاریخ میں طویل مدتوں اور زمانوں کے لیے بھی صحیح ہے یعنی یہ کہ گذرے ہوئے اور آنے والے ازمنہ کے درمیان کسی نوعی فرق کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر مختلف ادوار کے درمیان اس قسم کا فرق تسلیم کر لیا جائے تو تاریخ گذشتہ حالات و واقعات کا ایک بے معنی مجموعہ بن کر رہ جائے گی اور اس سے سبق حاصل کرنا یا اس میں اپنے لیے رہنمائی تلاش کرنا محض ایک عبث فعل ہو جائے گا۔ گذشتہ زمانہ کی تاریخ ہمارے لیے اسی صورت میں کارآمد ہو سکتی ہے جبکہ زمانہ گذشتہ اور زمانۂ حال میں کوئی بنیادی فرق یا تضاد نہ ہو۔ ورنہ اگر تغیر کوئی ایسا عمل ہے جس کی وجہ سے ہر زمانہ کا انسان دوسرے زمانہ کے انسان سے بالکلیہ مختلف ہو جاتا ہے تو پھر تاریخ کا مطالعہ کرنا فضول اور وقت کے سیاسی یا تمدنی مباحث میں اس کی عدالت سے فیصلہ طلب کرنا بے کار ہے۔

بلکہ ایسی حالت میں تو یہ بھی ناممکن ہے کہ تاریخی ارتقاء کی اس منزل پر ہم اُن انسانوں کے اجتماعی اعمال و محرکات اور طرزِ عمل کو سمجھ سکیں یا ان کی توجیہ کر سکیں جو ایک مختلف زمانہ میں پیدا ہوئے تھے اور جن کا ماحول ہمارے ماحول سے بنیادی طور پر مختلف تھا۔ کیونکہ جب تک ہم اپنے ذہن اور اپنی زندگی پر وہ تمام حالتیں نہ طاری کر لیں جن کے اندر سے زمانۂ گذشتہ کا انسان گذرا تھا، ہمارے لیے غیر ممکن ہے کہ ہم اُس کے تمدن یا معاشرت سے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں یا اُن اعمال اور اُن کے محرکات کو سمجھ سکیں جو اُن سے سرزد ہوئے تھے۔ لیکن اگر ہمارے موجودہ ذہن اور ہمارے محرکات اور نفسی اعمال، اُن انسانوں کی ذہنی اور نفسی کیفیات کے ساتھ کوئی یگانگت یا مماثلت نہیں رکھتے تو اُن حالتوں کا ہم پر طاری ہونا جن کے درمیان سے وہ گذر رہے تھے ایک امر محال ہے۔ لہٰذا اس صورت میں ہمارے اور اُن انسانوں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ لیکن تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے

ہمیں کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ گذشتہ زمانہ کا انسان کسی معنی میں ہم سے بنیادی طور پر مختلف تھا، یا جو محرکات آج ہمیں جنگ و صلح، دوستی و دشمنی اور تعمیر و تخریب کی طرف لے جاتے ہیں وہ اُن محرکات سے مختلف ہیں جو ازمنۂ گذشتہ کے انسان کو مذکورۂ بالا اعمال پر مائل کرتے تھے۔ زمانہ اور حالات کی تبدیلیوں کی بنا پر انسان اور انسان کے درمیان کسی نوعی فرق کو تسلیم کرنا (جو اس دعوے کو متضمن ہے کہ انسانی زندگی مسلسل تغیر کی حالت میں ہے) گویا اس بات کو ماننا ہے کہ تاریخ کے محققین نے ازمنہ ماضی کے انسان پر جو کچھ لکھا ہے وہ محض وہم وخیال ہے اور ان محققین نے ایک ایسی نوع کی تاریخ مرتب کرنے میں بے کار اپنا وقت ضائع کیا ہے جو اپنی فطرت، اپنی نفسی کیفیات اور اپنے جبلّیاتی میلانات کے اعتبار سے موجودہ انسان کے مقابلہ میں ایک جداگانہ اور کم تر ہستی رکھتی تھی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ انسان کی بنیادی فطرت آج بھی وہی ہے جو سینکڑوں ہزاروں سال پیشتر تھی۔

اگر اشتراکیوں اور دیگر مغربی مفکرین کے اس دعوے کو تسلیم کرلیا جائے کہ زندگی محض تغیر اور انقلاب کی ایک داستانِ مسلسل ہے تو پھر انسان کی معاشرتی، سیاسی یا تمدنی زندگی کی بابت کوئی کلیہ یا قانون صحیح نہیں ہوسکتا حالانکہ مورخ کو قدم قدم پر ایسے کلیات ترتیب دینے ہوتے ہیں جن سے وہ مختلف زمانوں کے واقعات کی توجیہ کرتا ہے۔ اگر مورخ اس مفروضہ پر کام کرے کہ تاریخ کا ہر واقعہ بالکل یکتا اور منفرد ہوتا ہے تو وہ مختلف واقعات کی کڑیوں کو کیونکر ایک سلسلہ میں جوڑ سکتا ہے اور پھر تاریخ میں بے ربط واقعات کے سوا اور کیا چیز باقی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ جو شے مسلسل تغیر و انقلاب کی حالت میں ہو اس کے متعلق کوئی قانون یا کلیہ بنانا تو غیر ممکن ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خود اشتراکی لٹریچر ایسے کلیات سے بھرا پڑا ہے۔ مثلاً مارکس اور اینجلس کے اس دعوے کو لیجیے جس سے اشتمالی منشور کا آغاز ہوتا ہے:۔

"انسان نے آج تک جتنے معاشرے قائم کیے ہیں اُن سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے۔ غلام اور آقا، امراء اور جمہور، سرمایہ دار اور مزدور، مختصر یہ کہ ظالم و مظلوم ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف اور باہم برسرِپیکار رہے ہیں۔"

اب اگر اس کلیہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ زمانہ کے تغیرات سے انسان کے حالات میں خواہ کتنی ہی تبدیلیاں واقع ہوئی ہوں، بہر حال ایک حقیقت کبھی نہیں بدلی؛ اور وہ یہ کہ انسانوں کے درمیان طبقہ واری تفریق اور طبقہ واری جنگ برابر قائم رہی ہے۔ یہ محض ایک کلیہ ہے۔ انسانی زندگی کے متعلق ایسے صدہا کلیات اور بھی قائم کیے جا سکتے ہیں اور کیے جا رہے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض غلط ہوں جیسا کہ مارکس اور اینجلس کا مذکورۂ بالا کلیہ غلط ہے۔ لیکن بہت سے کلیات صحیح بھی ہوتے ہیں۔ ایسے جتنے کلیات صحیح ہوں گے اتنے ہی غیر تبدیل پذیر اور تبدیل اور دائمی حقائق کا ماننا لازم آئے گا۔

ظاہر ہے کہ ان حقائق کے غیر تبدیل پذیر اور دائمی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ....

انسانی فطرت کی جن خصوصیات پر یہ مبنی ہیں وہ مرورِ زمانہ اور تغیرِ احوال کے باوجود یکساں اور غیر متغیر رہتے ہیں۔ حرکت و تبدیلی کے اُس تسلسل کے باوجود جو زندگی کے خارجی مظاہر میں جاری و ساری ہے، زندگی کی اصلی فطرت نہیں بدلتی۔ انسان کی فطری خصوصیات اور وہ غیر شعوری جذبات و ہیجانات (Impulses)، جو اس کے تمام شعوری افعال کی قوتِ محرکہ ہیں، خارجی احوال کی تبدیلیوں سے غیر متاثر رہتے ہیں۔ پس یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ماحول کی تبدیلی سے انسانی فطرت بدلی جا سکتی ہے۔ سطحی نظر سے دیکھنے والا اس غلط فہمی میں پڑ سکتا ہے کہ انسان میں اس تغیر سے کوئی جوہری تغیر واقع ہو جاتا ہے، کیونکہ سیاسی اور معاشی نظامات کے بدلنے سے انسانی اعمال میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ایسی تمام تبدیلیاں جو خارجی تغیرات سے پیدا ہوتی ہیں درحقیقت بنیادی تبدیلیاں نہیں بلکہ صوری تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ یعنی وہ صورتیں بدل جاتی ہیں جن میں انسانی فطرت اپنے خصوصیات کا اظہار کرتی ہے مگر خود یہ خصوصیات جوں کی توں برقرار رہتی ہیں۔

مثلاً انسان کی اس خصوصیت کو لیجیے کہ وہ جنگ و جدال کا عادی ہے۔ اب غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جنگجوئی انسان کی ایک حیاتیاتی فعلیت (Biological activity) ہے جو ہزاروں سال سے بالکل ایک نہج پر قائم ہے اور اُن تمام تغیرات کے باوجود جو انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں واقع ہوتے رہے ہیں اس فعلیت

میں کوئی کمی بیشی یا تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ انسان اُس وقت بھی ایک دوسرے سے جنگ آزما رہتا تھا جب وہ فولاد کے بجائے نکیلے پتھروں کے اسلحہ استعمال کرتا تھا۔ اور آج بھی وہ باہم برسرپیکار ہے جب طبعی علوم سے واقفیت کے بغیر جنگ لڑنا بالکل غیر ممکن ہے۔ اس پوری مدت میں جو تبدیلیاں جنگ سے متعلق ہوئی ہیں وہ صوری تبدیلیاں تھیں۔ یعنی جنگ کے آلات و اسلحہ بدل گئے، جنگی تدابیر اور طریقہ ہائے جنگ میں انقلاب برپا ہوگیا، فنونِ جنگ کی کایا پلٹ گئی۔ لیکن ان سب تبدیلیوں کے باوجود جنگ وجدال کے اسباب ومحرکات میں شمہ برابر بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ آج بھی انسان اپنے معاشی تفوق اور قومی وقار کو برقرار رکھنے کے لیے یا دوسروں پر اپنے عقائد ونظریات مسلط کرنے کی غرض سے قتل وخونریزی پر آمادہ ہوجاتا ہے اور پہلے بھی بالکل انہی اسباب کی بنا پر وہ باہم نزاع وفساد برپا کرتا تھا۔ وہ اخلاقی صفات جو صدیوں پیشتر فریقین کی فتح یا شکست پر موثر ہوتی تھیں، مشینوں اور آلات کی ترقی کے باوجود اب بھی اسی طرح فریقین کی فتح یا شکست کے لیے فیصلہ کن ہوتی ہیں۔ قومی یا جماعتی تخیل سے شدید محبت، اور اس محبت کے جنون میں زندگی کی راحتوں اور عیش وعشرت کی دلفریبیوں کو خاطر میں نہ لانا آج بھی فتح وکامرانی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور پہلے بھی تھا۔ اس لیے یہ دعویٰ کرنا بالکل مہمل ہے کہ مرورِ زمانہ اور امتدادِ وقت سے اخلاقی نظریات اور اُن کے اثرات یا حیاتیاتی افعال اور ان کے اسباب ونتائج بدل سکتے ہیں۔ صوری تبدیلیوں سے اصلیت نہیں بدلتی۔ فطرت کتنے ہی نقاب ڈال کر سامنے آئے، دیدۂ بینا ہو تو اسے پہچانا جاسکتا ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　　من انداز قدت را می شناسم

اسی طرح اس مشہور مقولہ کو لیجیے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے"۔ یہ مقولہ اپنے اندر ایک بڑی صداقت رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر تاریخی واقعہ پچھلے واقعات کی ہو بہو نقل نہیں ہوا کرتا اور تاریخ ان معنوں میں اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی کہ ہر نیا واقعہ گذشتہ واقعات کی محض تکرار ہو۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تاریخ کے مختلف ادوار اور ان کے حالات و واقعات کے درمیان ایک گہری مشابہت پائی جاتی ہے جس کی توجیہ کا اور کوئی طریقہ ممکن نہیں ہے بجز اس کے کہ تاریخی حالات و واقعات کی تشکیل میں انسان کی ان فطری اور غیر تبدیل پذیر

خصوصیات کا بڑا دخل ہے جو ہر زمانہ اور ہر عہد کے انسانوں میں یکساں طور پر مشترک ہوتی ہیں۔ خارجی مظاہر کی تمام تبدیلیوں اور تمدنی ارتقاء کی ساری منزلوں میں وہی ازلی حقائق اور بنیادی صداقتیں بار بار رنگ بدل بدل کر جلوہ نما ہوتی ہیں۔ تبدیلی صرف اُن اشکال اور مظاہر میں ہوتی ہے جن میں یہ صداقتیں ظہور کرتی ہیں۔ لیکن صورتوں کے بدلنے سے حقائق نہیں بدل سکتے۔ اس کی مثالیں ایک دو نہیں بے شمار دی جاسکتی ہیں کہ ایک ہی قسم کے حالات و موثرات کا ردِّ عمل انسان پر یکساں ہوتا ہے خواہ وہ کسی زمانہ سے تعلق رکھتا ہو۔ یکساں اسباب و علل یکساں نتائج پیدا کرتے ہیں۔ جنگ عظیم کے بعد یورپ میں آمری حکومتوں کا عوام کے ساتھ جو طرزِ عمل رہا ہے وہ کلیسا کے اس طرزِ عمل سے کیونکر مختلف ہے جو اس نے عوام کے مقابلہ میں قرونِ وسطیٰ میں اختیار کیا تھا؟ کیا ہٹلر مسولینی اور اسٹالن کی زندگی میں پاپاؤں کی روح نے دوبارہ زندگی نہیں حاصل کی ہے؟ پاپائے روم کی معصومیت اور اس کے بری عن الخطاء (Doctrine of Papal infallibility) ہونے کا عقیدہ جو رومن کیتھولک عیسائیوں میں آج تک کسی نہ کسی درجہ میں باقی ہے، جرمنی اور اٹلی اور روس کے عوام اور نازی اور فاسسٹی اور اشتراکی جماعتوں کے اندر ایک نئے روپ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اس عقیدہ نے ایک مذہبی رنگ اختیار کیا تھا۔ جرمنی، اٹلی اور روس میں اس کا رنگ سیاسی ہے۔ لیکن بنیادی تخیل اور روح کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر کیا ہٹلر، مسولینی اور اسٹالن کے پیرووں پر نظر کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا سے آج وہ ذہنیت ناپید ہوگئی ہے جس کی اصلاح کرنے کے لیے قرآن حکیم نے اہلِ کتاب سے کہا تھا:

يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔

اے اہلِ کتاب آؤ ہم تم دونوں ایک ایسے کلمہ پر جمع ہو جائیں جو ہم میں اور تم میں برابر ہو اور وہ یہ کہ نہ تو ہم خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کریں، نہ اس کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھیرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب قرار دے (رب تو بس اللہ ہی ہے)

اگر اس آیت میں اہل کتاب کی جگہ اسٹالن، ہٹلر اور مسولینی کے پیروؤں کا نام لے لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس صداقت کی طرف قرآن کریم اہل کتاب کو تیرہ سو برس پیشتر دعوت دے رہا تھا، دنیا آج بھی اسی صداقت کے لیے تشنگی محسوس کر رہی ہے کیونکہ قومی لیڈروں اور ڈکٹیٹروں اور کارل مارکس جیسے یک رُخے انسانوں کو ارباب من دون اللہ آج بھی قرار دیا جا رہا ہے۔ یا پھر مشرکین عرب کے اس طرز عمل کو لیجیے جو انھوں نے آخرت کے وجود سے انکار کرتے ہوئے اختیار کیا تھا۔ کیا آج اشتراکی جماعت کے ارکان وہی طرز عمل نہیں برت رہے ہیں؟ مشرکین عرب بھی تو کہتے تھے کہ اس زندگی کے بعد کسی دوسری زندگی کا ثبوت ہمارے تجربات و مشاہدات اور معلومہ ذخیرۂ علم سے نہیں ملتا۔ کیا آج روسی اشتمالیوں کا استدلال اس سے مختلف ہے؟ روسی اشتمالیوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ طبعی علوم کے نتائج تحقیق سے ماورائے مادہ کسی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا۔ نقطۂ نظر کے اعتبار سے عرب کے مشرکین اور بیسویں صدی کے اشتراکیوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ جو کچھ فرق ہے وہ مبلغ علم کا ہے، طرز ادا کا ہے اور زبان و بیان کا ہے۔ باقی رہی شرک و الحاد کی حقیقت تو وہ آج بھی اسی طرح موجود ہے جیسے تیرہ سو برس پہلے تھی

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ زندگی محض تغیر نہیں ہے بلکہ اس میں عدم تغیر کا عنصر بھی شامل ہے۔ انسان کے تمدنی اور معاشرتی ارتقاء سے وہ مظاہر و اشکال بدل جاتے ہیں جن میں حقائق نمود کرتے ہیں۔ لیکن زندگی اور فطرت کی بنیادی حقیقتیں اٹل ہیں۔ حرکت اور تغیر کے فلسفہ کو سمجھنے کے لیے زمین کی گردش کو بطور مثال سامنے رکھیے۔ ایک لحاظ سے دیکھیے تو زمین مسلسل گردش میں ہے۔ لیکن ایک دوسرے پہلو سے دیکھیے تو زمین اپنے محور پر قائم ہے اور اس کی ساری گردش و حرکت اسے اپنے محور سے نہیں ہٹا سکتی۔ ایک اعتبار سے زمین سورج کے گرد ایک بیضاوی دائرے میں حرکت کرتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس حرکت کے خطوط مقرر ہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ زمین اپنے مقررہ راستہ سے ہٹ جائے یا کسی دوسرے دائرے میں حرکت کرنے لگے۔ ہر مرتبہ گردش کرتے ہوئے وہ بالآخر پھر انھیں نقاط سے گزرتی

ہے جن سے پہلے گذر چکی ہے۔ یہی حالت زندگی کی ہے کہ اس میں تغیر وحرکت بھی ہے اور عدم تغیر بھی۔ مذہب میں جمود اور ٹھیراؤ اس لیے پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے نمائندے حرکت وتغیر اور اشکال ومظاہر کی تبدیلیوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ لیکن اس جمود اور ٹھیراؤ سے زیادہ خطرناک حرکت وتغیر کا نیا فلسفہ ہے جو حقائق کے دوام واستمرار اور فطرت میں عدم تغیر کے عنصر کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اسی فلسفہ کے باعث آج انسان اپنے وجود اور اپنی فطرت کے خلاف برسرپیکار ہے اور اس تمنائے خام میں مبتلا ہے کہ محض خارجی نظامات کے ردّو بدل سے وہ دنیا میں فلاح وصلاح کا راستہ تلاش کر سکتا ہے۔

اسلام میں مرتد کا حکم

کیا حکومتِ اسلامی میں تبلیغِ کفر کی اجازت ہے؟

مجرد مذہب اور مذہبی ریاست کا بنیادی فرق

گذشتہ صفحات میں ہم نے قتلِ مرتد پر اعتراض کرنے والوں کے جو دلائل نقل کیے ہیں اور ان کے جواب میں اپنی طرف سے جو دلائل پیش کیے ہیں ان کا مقابلہ کرنے سے ایک بات بالکل واضح طور پر نظر کے سامنے آجاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ معترضین مرتد کی سزا پر جتنے اعتراض کرتے ہیں محض ایک "مذہب" کو نگاہ میں رکھ کر کرتے ہیں، اور اس کے برعکس ہم اس سزا کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے جو دلائل دیتے ہیں ان میں ہمارے پیشِ نظر مجرد مذہب نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا اسٹیٹ ہوتا ہے جو کسی خاندان یا طبقہ یا قوم کی حاکمیت کے بجائے ایک دین اور اس کے اصولوں کی حاکمیت پر تعمیر ہوا ہو۔ جہاں تک مجرد مذہب کا تعلق ہے، ہمارے اور معترضین کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایسا مذہب مرتد کو سزا دینے کا حق نہیں رکھتا جب کہ سوسائٹی کا نظم و نسق اور ریاست کا وجود عملاً اس کی بنیاد پر قائم نہ ہو ـــ جہاں اور جن حالات میں اسلام فی الواقع ویسے ہی ایک مذہب کی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ معترضین کا تصورِ مذہب ہے، وہاں ہم بھی مرتد کو سزائے موت دینے کے قائل نہیں ہیں۔ فقہ اسلامی کی رو سے محض ارتداد کی سزا ہی نہیں، اسلام کے تعزیری احکام میں سے کوئی حکم بھی ایسے حالات میں قابلِ نفاذ نہیں ہوتا جبکہ اسلامی ریاست (یا باصطلاحِ شرع "سلطان") موجود نہ ہو ـــ لہٰذا مسئلہ کے اس پہلو میں ہمارے اور معترضین کے درمیان بحث خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اب قابلِ بحث صرف دوسرا پہلو رہ جاتا ہے یعنی یہ کہ جہاں مذہب خود حاکم ہو، جہاں مذہبی قانون ملکی قانون ہو، اور جہاں مذہب ہی نے امن و انتظام کے برقرار رکھنے کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہو، آیا وہاں بھی مذہب ایسے لوگوں کو سزا دینے کا حق رکھتا ہے یا نہیں جو اس کی اطاعت و وفاداری کا عہد کرنے کے بعد اس سے پھر جائیں؟ ہم اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ کیا ہمارے معترضین کے پاس اس کا جواب نفی میں ہے؟ اگر نہیں

تو اختلاف بالکل ہی دور ہوا جاتا ہے، اور اگر ہے تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس پر انھیں کیا اعتراض ہے اور کیا ان کے دلائل ہیں؟

ریاست کا قانونی حق یہ ایک الگ بحث ہے کہ آیا مذہبی ریاست بجائے خود صحیح ہے یا نہیں۔ چونکہ اہل مغرب کی پشت پر پاپایانِ روم کی ایک المناک تاریخ ہے جس کے زخم خوردہ ہونے کی وجہ سے وہ مذہبی ریاست کا نام سنتے ہی خوف سے لرز اٹھتے ہیں اس لیے جب کبھی کسی ایسی چیز کے متعلق انھیں گفتگو کا اتفاق ہوتا ہے جس پر "مذہبی ریاست" ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہو (اگرچہ اس کی نوعیت پاپائی سے بالکل مختلف ہی کیوں نہ ہو)، تو جذبات کا ہیجان ان کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ بیچارے اس پر ٹھنڈے دل سے معقول گفتگو کر سکیں۔ رہے ان کے مشرقی شاگرد تو اجتماعی و عمرانی مسائل پر ان کا سرمایۂ علم جو کچھ بھی ہے مغرب سے مستعار لیا ہوا ہے اور یہ اپنے استادوں سے صرف ان کی معلومات ہی ورثہ میں حاصل نہیں کرتے بلکہ میراث علمی کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات، رجحانات اور تعصبات بھی لے لیتے ہیں اس لیے قتل مرتد اور اس نوعیت کے دوسرے مسائل پر جب بحث کی جاتی ہے تو خواہ اہل مغرب ہوں یا اُن کے مشرقی شاگرد بالعموم دونوں ہی اپنا توازن کھو دیتے ہیں اور اصل قانونی و دستوری سوال کو اُن بحثوں میں الجھانے لگتے ہیں جو مذہبی ریاست کے بذات خود صحیح یا غلط ہونے کی بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالانکہ اگر بالفرض اسلامی ریاست انھی معنوں میں ایک "مذہبی ریاست" ہو جن معنوں میں اہل مغرب اسے لیتے ہیں، تب بھی اس مسئلہ میں یہ بحث بالکل غیر متعلق ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ جو ریاست کسی خطۂ زمین پر حاکمیت رکھتی ہو، آیا وہ اپنے وجود کی حفاظت کے لیے ایسے افعال کو جرم قرار دینے کا حق رکھتی ہے یا نہیں جو اس کے نظام کو درہم برہم کرنے والے ہوں؟ اس پر اگر کوئی معترض ہو تو وہ ہمیں بتائے کہ دنیا میں کب ریاست نے یہ حق استعمال نہیں کیا ہے اور آج کونسی ریاست ایسی ہے جو اس حق کو استعمال نہیں کر رہی ہے۔ اشتراکی اور فاشسٹ ریاستوں کو چھوڑیے، انھی جمہوری ریاستوں ہی کو دیکھ لیجیے جن کی تاریخ اور جن کے نظریات سے موجودہ زمانہ کی دنیا نے جمہوریت کا سبق سیکھا ہے اور جن کو آج جمہوری نظام کی علمبرداری کا شرف حاصل ہے۔ کیا یہ اس حق کو استعمال نہیں کر رہی ہیں؟

انگلستان کی مثال مثال کے طور پر انگلستان کو لیجیے۔ انگریزی قانون جن لوگوں سے بحث کرتا ہے وہ دو بڑی قسموں

پر تقسیم ہوتے ہیں: ایک برطانوی رعایا (British subjects) - دوسرے اغیار (Allies)۔ برطانوی رعایا کا اطلاق اولاً ان لوگوں پر ہوتا ہے جو برطانوی حدود کے اندر یا باہر ایسے باپوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہوں جو شاہ برطانیہ کی اطاعت و وفاداری کے ملتزم ہوں)، یہ فطرۃً پیدائشی رعایائے برطانیہ (Natural born British Subjects) کہلاتے ہیں اور ان کو آپ سے آپ اطاعت و وفاداری کا ملتزم قرار دیا جاتا ہے بغیر اس کے کہ انھوں نے بالارادہ شاہ برطانیہ کی وفاداری کا حلف لیا ہو۔ ثانیاً یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو پہلے اغیار میں سے تھے اور پھر چند قانونی شرائط کی تکمیل کے بعد انھوں نے شاہ برطانیہ کی وفاداری کا حلف لے کر برطانوی رعایا ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا ہو۔ رہے اغیار تو اس سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو کسی دوسری قومیت سے تعلق رکھتے ہوں اور کسی دوسرے اسٹیٹ کی وفاداری کے ملتزم ہوں مگر برطانوی مملکت کی حدود میں مقیم ہوں۔ ان مختلف قسم کے اشخاص کے متعلق انگریزی قانون کے حسب ذیل اصول قابل ملاحظہ ہیں:-

۱- اغیار میں سے ہر شخص جو برطانوی رعایا ہونے کے لیے ضروری قانونی شرائط کی تکمیل کر چکا ہو، یہ اختیار رکھتا ہے کہ اپنی سابق قومیت ترک کر کے برطانوی قومیت میں داخل ہونے کی درخواست کرے۔ اس صورت میں سکرٹری آف اسٹیٹ اس کے حالات کی تحقیق کرنے کے بعد شاہ برطانیہ کی اطاعت و وفاداری کا حلف لے کر اسے برطانوی قومیت کا سرٹیفکیٹ عطا کر دے گا۔

۲- کوئی شخص خواہ پیدائشی رعایائے برطانیہ ہو، یا باختیار خود برطانوی رعایا میں داخل ہوا ہو، از روئے قانون یہ حق نہیں رکھتا کہ مملکت برطانیہ کے حدود میں رہتے ہوئے کسی دوسری قومیت کو اختیار کر لے اور کسی دوسرے اسٹیٹ کی وفاداری کا حلف اٹھائے، یا جس قومیت سے وہ پہلے تعلق رکھتا تھا اس کی طرف پھر واپس چلا جائے۔ یہ حق اسے صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ برطانوی حدود سے باہر مقیم ہو۔

۳- برطانوی حدود سے باہر مقیم ہونے کی صورت میں بھی رعایائے برطانیہ کا کوئی فرد (خواہ وہ پیدائشی رعیت ہو یا رعیت بن گیا ہو) یہ حق نہیں رکھتا کہ حالت جنگ میں برطانوی قومیت ترک کر کے کسی ایسی قوم کی قومیت اور کسی ایسے

اسٹیٹ کی وفاداری اختیار کرے جو شاہ برطانیہ سے برسر جنگ ہو یہ فعل برطانوی قانون کی رو سے غدر کبیر (High treason) ہے جس کی سزا موت ہے۔

۴۔ برطانوی رعایا میں سے جو شخص برطانوی حدود کے اندر یا باہر رہتے ہوئے بادشاہ کے دشمنوں سے تعلق رکھے اور ان کو مدد اور آسائش بہم پہنچائے یا کوئی ایسا فعل کرے جو بادشاہ کے دشمنوں کو تقویت پہنچانے والا یا بادشاہ اور ملک کی قوتِ حملہ و مدافعت کو کمزور کرنے والا ہو وہ بھی غدر کبیر کا مرتکب ہے اور اس کی سزا بھی موت ہے۔

۵۔ بادشاہ، ملکہ یا ولی عہد کی موت کے درپے ہونا یا اس کا تصور کرنا۔ بادشاہ کی رفیقہ یا اس کی بڑی بیٹی یا ولی عہد کی بیوی کو بے حرمت کرنا، بادشاہ کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرنا یا نشانہ تاکنا یا ہتھیار اس کے سامنے لانا جس سے مقصود اس کو نقصان پہنچانا یا خوف زدہ کرنا ہو، اسٹیٹ کے مذہب کو تبدیل کرنے یا اسٹیٹ کے قوانین کو منسوخ کرنے کے لیے قوت استعمال کرنا۔ یہ سب افعال بھی غدر کبیر ہیں اور ان کا مرتکب بھی سزائے موت کا مستحق ہے۔

۶۔ بادشاہ کو اس کے منصب، اعزاز یا القاب سے محروم یا معزول کرنا بھی جرم ہے جس کی سزا حبس دوام تک ہو سکتی ہے۔

ان سب امور میں بادشاہ سے مراد وہ شخص ہے جو بالفعل (De facto) بادشاہ ہو خواہ بالحق (De jure) بادشاہ ہو یا نہ ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ قوانین کسی جذباتی بنیاد پر مبنی نہیں ہیں بلکہ اس اصول پر مبنی ہیں کہ قائم شدہ ریاست جس کے قیام پر ایک خطۂ زمین میں سوسائیٹی کے نظم کا قیام منحصر ہو، اپنے اجزائے ترکیبی کو انتشار سے بجبر روکنے اور اپنے نظام کو خرابی سے بچانے کے لیے طاقت کے استعمال کا حق رکھتی ہے۔ برطانوی قانون جنہیں "اغیار" کہتا ہے ان کی حیثیت تقریباً وہی ہے جو اسلامی قانون میں اُن لوگوں کی حیثیت ہے جو "ذمی" کہلاتے ہیں۔ "برطانوی رعایا" کا اطلاق جس طرح پیدائشی اور اختیاری رعایا پر ہوتا ہے اسی طرح اسلام میں بھی "مسلمان" کا اطلاق دو قسم کے لوگوں پر ہوتا ہے، ایک وہ جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوں، دوسرے وہ جو غیر مسلموں میں سے باختیار خود اسلام قبول کریں۔ برطانوی قانون بادشاہ اور شاہی خاندان کو صاحب حاکمیت ہونے کی حیثیت سے جو مقام دیتا ہے اسلامی قانون وہی حیثیت "دین"

کے بنیادی اصولوں کو دیتا ہے۔ پھر جس طرح برطانوی قانون برطانوی رعایا اور اغیار کے حقوق و واجبات میں فرق کرتا ہے اسی طرح اسلام بھی مسلم اور ذمّی کے حقوق و واجبات میں فرق کرتا ہے۔ جس طرح برطانوی قانون برطانوی رعایا میں سے کسی شخص کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ حدود مملکت برطانیہ میں رہتے ہوئے کسی دوسری قومیت کو اختیار کرے اور کسی دوسرے اسٹیٹ کی وفاداری کا حلف اُٹھائے یا اپنی سابق قومیت کی طرف پلٹ جائے، اسی طرح اسلامی قانون بھی کسی مسلم کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ دارالاسلام کے اندر رہتے ہوئے کوئی دوسرا دین اختیار کرے یا اس دین کی طرف پلٹ جائے جسے ترک کر کے وہ دینِ اسلام میں آیا تھا۔ جس طرح برطانوی قانون کی رو سے برطانوی رعایا کا وہ فرد سزائے موت کا مستحق ہے جو برطانوی حدود کے باہر رہتے ہوئے تاجِ برطانیہ کے دشمنوں کی قومیت اختیار کرلے اور کسی دشمن سلطنت کی وفاداری کا حلف اٹھائے، اسی طرح اسلامی قانون کی رو سے وہ مسلمان بھی سزائے موت کا مستحق ہے جو دارالاسلام کے باہر رہتے ہوئے حربی کافروں کا دین اختیار کرلے۔ اور جس طرح برطانوی قانون ان لوگوں کو "اغیار" کے سے حقوق دینے کے لیے تیار ہے جنھوں نے برطانوی قومیت چھوڑ کر کسی برسرِ صلح قوم کی قومیت اختیار کرلی ہو اسی طرح اسلامی قانون بھی ایسے مرتدین کے ساتھ معاہد قوم کے کافروں کا سا معاملہ کرتا ہے جو دارالاسلام سے نکل کر کسی ایسی کافر قوم سے جا ملے ہوں جس سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو۔ اب یہ ہمارے لیے ایک ناقابلِ حل معمّا ہے کہ جن لوگوں کی سمجھ میں اسلامی قانون کی پوزیشن نہیں آتی ان کی سمجھ میں برطانوی قانون کی پوزیشن کیسے آجاتی ہے۔

امریکہ کی مثال برطانیہ کے بعد دنیا کے دوسرے علمبردارِ جمہوریت ملک، امریکا کے قوانین بھی اگرچہ تفصیلات میں کسی حد تک اس سے مختلف ہیں، لیکن اصول میں اس کے ساتھ پوری موافقت رکھتے ہیں۔ فرق بس یہ ہے کہ یہاں جو مقام بادشاہ کو دیا گیا ہے وہاں وہی مقام ممالکِ متحدہ اور ان کے دستور کو دیا گیا ہے۔ ممالکِ متحدہ کا پیدائشی شہری (Citizen) ہر وہ شخص ہے جو شہری کی اولاد سے پیدا ہو، خواہ ممالکِ متحدہ کے حدود میں پیدا ہو یا ان سے باہر۔ اور اختیاری شہری ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو چند قانونی شرائط کی تکمیل کے بعد دستورِ ممالکِ متحدہ کے اصولوں کی وفاداری کا حلف اٹھائے۔ ان دونوں قسم کے شہریوں کے ماسوا باقی سب لوگ امریکی قانون کی نگاہ میں "غیر" ہیں اور امریکی قانون شہری اور اغیار کے حقوق

وواجبات کے درمیان وہی فرق کرتا ہے جو برطانوی قانون "رعیت" اور "اغیار" کے حقوق وواجبات میں کرتا ہے۔ ایک غیر شخص شہریت کی قانونی شرطیں پوری کرنے کے بعد ممالک متحدہ کا شہری بن جانے میں تو آزاد ہے مگر شہری بن جانے کے بعد پھر اسے یہ آزادی حاصل نہیں رہتی کہ ممالک متحدہ کے حدود میں رہتے ہوئے وہ اس شہریت کو ترک کرکے پھر اپنی سابق قومیت کی طرف پلٹ جائے۔ اور اسی طرح کسی پیدائشی شہری کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ ممالک متحدہ کے حدود میں کسی دوسری قومیت کو اختیار کرے اور کسی دوسرے اسٹیٹ کی وفاداری کا حلف اٹھائے۔ علی ہذا القیاس شہریوں کے لیے غدر اور بغاوت کے قوانین ممالک متحدہ میں بھی انھی اصولوں پر مبنی ہیں جن پر برطانوی قوانین غدر وبغاوت کی اساس رکھی گئی ہے۔ اور یہ کچھ انہی دونوں سلطنتوں پر موقوف نہیں ہے بلکہ دنیا کے جس ملک کا قانون بھی آپ اٹھا کر دیکھیں گے وہاں آپ کو یہی اصول کام کرتا نظر آئے گا کہ ایک اسٹیٹ جن عناصر کے اجتماع سے تعمیر ہوتا ہے ان کو وہ منتشر ہونے سے بزور روکتا ہے اور ہر اس چیز کو طاقت سے دباتا ہے جو اس کے نظام کو درہم برہم کرنے کا رجحان رکھتی ہو۔

ریاست کا فطری حق | یہ ایک جداگانہ بحث ہے کہ ایک اسٹیٹ کا وجود بجائے خود جائز ہے یا نہیں۔ اس معاملہ میں ہمارا اور دنیوی ریاستوں (Secular stares) کے حامیوں کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک خدا کی حاکمیت کے سوا ہر دوسری حاکمیت پر ریاست کی تعمیر ناجائز ہے اس لیے جو ریاست بجائے خود ناجائز بنیاد پر قائم ہو اس کے لیے ہم اس بات کو جائز تسلیم نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے ناجائز وجود اور غلط نظام کی حفاظت کے لیے قوت استعمال کرے۔ اور اس کے برعکس ہمارے مخالفین الٰہی ریاست کو ناجائز اور صرف دنیوی ریاست ہی کو جائز سمجھتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک دنیوی ریاست کا اپنے وجود و نظام کی حفاظت میں جبر سے کام لینا عین حق اور الٰہی ریاست کا یہی فعل کرنا عین باطل ہے لیکن اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ قاعدہ اپنی جگہ عالمگیر مقبولیت رکھتا ہے کہ ریاست اور حاکمیت کی عین فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ اسے اپنے نظام کی حفاظت کے لیے جبر اور قوت کے استعمال کا حق حاصل ہو۔ یہ حق ریاست من حیث الریاست کا ذاتی حق (Inherent right) ہے اور اگر کوئی چیز اس حق کو باطل بناتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جو ریاست اس حق سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہو وہ آپ ہی باطل پر قائم ہوئی ہو اس لیے کہ باطل کا قیام بجائے خود

ایک جرم ہے اور اگر وہ اپنے قیام کے لیے طاقت سے کام لیتا ہے تو یہ شدید تر جرم ہو جاتا ہے۔

کافر اور مرتد کے ساتھ مختلف معاملہ کیوں ہے؟ اکثر لوگوں کے لیے یہ سوال سخت الجھن کا موجب بن جاتا ہے کہ ابتداءً کافر ہونے اور اسلام سے مرتد ہو کر کافر بن جانے میں آخر کیا فرق ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ جو قانون ایک شخص کے ابتداءً کافر ہونے کو برداشت کر لیتا ہے اور اسے اپنے حدود میں امن کی جگہ عطا کرتا ہے وہ آخر اسی شخص کے اسلام میں داخل ہونے کے بعد پھر کافر ہو جانے کو اور ایک پیدائشی مسلمان کے کفر اختیار کر لینے کو کیوں برداشت نہیں کرتا؟ پہلی قسم کے کافر کا کفر اس دوسری قسم کے کافر کے کفر سے اصولاً کیا اختلاف رکھتا ہے کہ وہ تو قانون کی نگاہ میں جرم نہ ہو اور یہ جرم ہو، اس کو ذمی بنا کر اس کی جان و مال کی حفاظت کی جائے اور اسے زندگی کے جملہ حقوق سے محروم کر کے دار پر چڑھا دیا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نہ ملنے والے اور مل کر الگ ہو جانے والے کے درمیان انسانی فطرت لازماً فرق کرتی ہے۔ نہ ملنا منافرت اور عداوت کو مستلزم نہیں ہے۔ مگر مل کر الگ ہو جانا قریب قریب سو فی صدی حالات میں ان جذبات کو مستلزم ہے۔ نہ ملنے والا مخالفت میں اتنا سرگرم نہیں ہوتا جس قدر مل کر الگ ہو جانے والا سرگرم ہوتا ہے۔ نہ ملنے والا کبھی ان فتنوں کا موجب نہیں بن سکتا جن کا موجب مل کر الگ ہو جانے والا بنتا ہے۔ نہ ملنے والے کے ساتھ آپ تعاون، دوستی، معاملت اور اخلاقی و مادی اور معاشرتی تعلقات کے وہ رشتے قائم نہیں کرتے جو ملنے والے کے ملاپ پر اعتماد کر کے اس کے ساتھ قائم کرتے ہیں، اس لیے نہ ملنے والا کبھی ان نقصانات کا سبب نہیں بن سکتا جن کا موجب مل کر الگ ہو جانے والا بنتا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان نہ ملنے والوں کی بہ نسبت اُن لوگوں کے ساتھ فطرۃً بالکل دوسری ہی قسم کا برتاؤ کرتا ہے جو مل کر الگ ہو جاتے ہیں۔ انفرادی زندگی میں اتصال کے بعد افتراق کا نتیجہ محدود ہوتا ہے اس لیے عموماً کشیدگی تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں یہ چیز زیادہ بڑے پیمانے پر نقصان کی موجب ہوتی ہے اس لیے فرد کے خلاف جماعت کی کارروائی بھی زیادہ سخت ہوتی ہے اور جہاں الگ ہونے والا کوئی فرد واحد نہیں بلکہ کوئی طاقتور گروہ ہوتا ہے وہاں نقصان کا پیمانہ بہت بڑھ جاتا ہے اس لیے اس کا نتیجہ لازماً جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

جو لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ کافر اور مرتد کے ساتھ اسلام دو مختلف رویے کیوں اختیار کرتا ہے، انھیں تمام

معلوم نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جو اپنے اندر شامل نہ ہونے والوں اور شامل ہو کر الگ ہو جانے والوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا ہو۔ الگ ہونے والوں کو اکثر کسی نہ کسی نوعیت کی سزا ضرور دی جاتی ہے اور بارہا ان کو واپس آنے پر مجبور بھی کیا جاتا ہے۔ خصوصاً جو نظام جتنی زیادہ اہم اجتماعی ذمہ داریوں کا حامل ہو اس کا رویہ اس معاملہ میں اتنا ہی زیادہ سخت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر فوج کو لیجیے۔ قریب قریب تمام دنیا کے فوجی قوانین میں یہ بات مشترک ہے کہ فوجی ملازمت اختیار کرنے پر تو کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا مگر جو شخص باختیار خود فوجی ملازمت میں داخل ہو چکا ہو اسے ملازمت میں رہنے پر لازماً مجبور کیا جاتا ہے۔ وہ استعفا دے تو نا قابل قبول ہے، خود چھوڑ جائے تو مجرم ہے۔ جنگ کی عملی خدمت (Active service) سے فرار ہو تو سزائے موت کا مستحق ہے۔ عام فوجی خدمات سے بھاگے تو حبس دوام تک کی سزا پا سکتا ہے، اور جو کوئی اس بھاگنے والے کو پناہ دے یا اس کے جرم پر پردہ ڈالے تو وہ بھی مجرم ٹھیرتا ہے۔ یہی طرز عمل انقلابی پارٹیاں اختیار کرتی ہیں۔ وہ بھی کسی کو اپنے اندر شامل ہونے پر مجبور نہیں کرتیں مگر جو شامل ہو کر الگ ہو جائے اسے گولی مار دیتی ہیں۔

یہ معاملہ تو فرد اور جماعت کے درمیان ہے۔ اور جہاں جماعت اور جماعت کے درمیان یہ صورت پیش آتی ہے وہاں اس سے زیادہ شدید معاملہ کیا جاتا ہے۔ وفاق (Federation) اور تحالف (Confederacy) کے متعلق اکثر آپ نے سنا ہوگا کہ جو ریاستیں اس قسم کے اتحاد میں شریک ہوتی ہیں ان کو شریک ہونے یا نہ ہونے کا اختیار تو دیا جاتا ہے مگر شریک ہو چکنے کے بعد الگ ہو جانے کا دروازہ از روئے دستور بند کر دیا جاتا ہے۔ اور جہاں دستور میں اس قسم کی کوئی تصریح نہیں ہوتی وہاں بھی علیحدگی کے حق کا استعمال اکثر جنگ تک نوبت پہنچا دیتا ہے۔ انیسویں صدی میں دو لڑائیاں اسی مسئلہ پر ہو چکی ہیں۔ پہلی لڑائی سوئٹزرلینڈ میں ہوئی جبکہ ۱۸۴۶ء میں سات رومن کیتھولک ریاستوں نے کانفیڈریسی سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس پر کانفیڈریسی کے باقی شرکاء ان الگ ہونے والی ریاستوں سے برسرِ پیکار ہو گئے اور انھوں نے لڑ کر انھیں مجبور کیا کہ پھر ان کی وفاقی ریاست میں شامل ہو جائیں۔ دوسری لڑائی امریکہ کی خانہ جنگی (American civil war) کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۸۶۱ء میں ممالک متحدہ امریکہ کے اتحاد سے سات ریاستیں الگ ہو گئیں اور انھوں نے اپنا علیحدہ

(باقی مضمون صفحہ ۷۰۸ پر درج ہے)

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین میں مولانا نے ہر طرح کے سوالات کے جوابات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۴۴)	"
خلافیات	(۱۵)	"
عام مسائل	(۷)	"
معاشی مسائل	(۱۵)	"
سیاسی مسائل	(۱۰)	"

ضخامت ۲۰۸ صفحات قیمت مجلد مع گرد پوش پانچ روپے چار آنے

اپنے شہر کے کتب فروشوں مقامی جماعت اسلامی کے مکتبوں

یا

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور سے طلب کیجئے

تفہیمات حصہ دوم

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جس کا ایک عرصے سے انتظار تھا   اب پیش کی جا رہی ہے

زمانۂ حاضرہ کے دماغوں میں اسلام کے مبادی کو مستحکم کرنے اور اسکے تقاضوں کی تکمیل کے لئے عملی روح کو بیدار کرنے کے لئے مولانا مودودی کی تالیفات کو جو اہمیت حاصل ہے ، محتاج بیان نہیں ۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر نے

نہ صرف پاکستان و ہندوستان کے مسلمانوں ، بلکہ پورے عالم اسلامی کے مسلمانوں کو اسلام کی عالمگیر انقلابی تحریک کے لئے بیدار اور تیار کرنے کا کام کیا ہے ۔ کر رہا ہے ، اور کرتا رہے گا ۔ انشاءاللہ ۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے ۔

اس میں جن اہم اور معرکۃالارا مسائل پر
گفتگو کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں

- قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے
- حقیقت جن
- معنی خلافت
- فتنہ تکفیر
- قربانی پر منکرین حدیث کا حملہ
- ہیگل اور مارکس کا فلسفہ تاریخ
- ڈارون کا نظریہ ارتقا
- لباس کا مسئلہ
- غلامی کا مسئلہ
- نماز میں آلہ مکبر الصوت کا استعمال

ضخامت ($\frac{20 \times 26}{8}$) ۳۹۶ صفحات   قیمت سات روپے صرف

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ ۔ لاہور

سرورق ریبن پرنٹنگ پریس ۔ بل روڈ ۔ لاہور میں چھپا